جلد ۳ شمارہ ۱
اکتوبر 2002 تا مارچ 2003ء

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

سامراجیت کے دورنگ: سرمایہ دارانہ زرعی پالیسی اور جنگ

امریکی سامراجیت کی کھلی نشانی عراق پر امریکی حملہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی جارحیت نے ۱۱ ستمبر کے بعد اپنی اصلی شکل دکھانے میں انکساری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائیزیشن (ڈبلیو ٹی او) اور اس کے مختلف معاہدے دراصل اس جارحیت ہی کا دوسرا رخ ہے۔ زرعی معاہدے کے علاوہ اس سے جڑے ہوئے بیشتر معاہدے ایک خاموش وار ہیں، جن کے ذریعے امریکہ اور جی۔۸ کے ممالک تیسری دنیا کے پیداواری نظام کو بے بس کر کے خود اس پیداواری صلاحیت پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ اس طرح عالمی منڈی میں لائی جانے والی تمام پیداوار کے اوپر انہیں مکمل اختیار حاصل ہوگا۔ ڈبلیو ٹی او کے دوہا وزارتی اجلاس کے بعد زرعی معاہدوں کے متعلق ''ہارمنسن مسودہ'' عالمی زرعی پیداوار کو سرمایہ دارانہ نظام کا غلام بنانے کے لیے نیا منصوبہ ہے۔ سرمایہ دارانہ قوتوں کی آپس میں چپقلش نے فی الحال اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے روک دیا ہے۔ ماضی کے سامراجی حکمران برطانوی راج کا دور حاضر کے امریکی سامراج سے موازنہ کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ہی کا مقصد آزاد تجارت کو منافع اکھٹا کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ برطانوی راج نے جو شدید مظالم ہندوستان کی عوام پر ڈھائے اور جو طریقہ کار ان مظالم کو ڈھانے کے لیے استعمال کیے وہ آج کل کے عالمی مالیاتی اور تجارتی اداروں کی حکمت عملی سے کسی طور مختلف نہیں۔ ۱۸۷۷ میں ہندوستان کی سرزمین پر نا قابل فراموش قحط، جس میں لاکھوں افراد، جن میں زیادہ تر کا تعلق مزدور کسان طبقے سے تھا، نے بھوک سے تڑپ کر ملکہ وکٹوریہ کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان تک خوراک نہ پہنچنے کی وجہ برطانوی سامراج کی آزاد تجارت کی پالیسیاں اور جنگی منصوبے تھے، جن کے تحت وہ دنیا کے مختلف خطوں پر قبضہ جمانے کی ''تحریک'' چلا رہے تھے۔ آج یوں لگتا ہے کہ امریکی سامراجی پالیسیاں برطانوی راج کے اسی عمل کو دہرا رہی ہیں۔

ہندوستان کا وہ بااثر طبقہ جس نے برطانوی سامراج کو اپنی سرزمین پر قدم جمانے اور ظلم کی ہر راہ ہموار کرنے میں معاونت کی تھی، آج کے ہندو پاک کے قابض طبقے میں پھر سے اپنی شکل دکھا رہا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی عوام کو ایک بار پھر شدید بھوک کا سامنا ہے اور ان ممالک کے حکمران اور اعلیٰ افسران سرمایہ دارانہ نظام کی قوتوں کو اپنی ہر کوشش سے مزید مستحکم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی مزدور کسان سخت غربت کے شکار ہیں۔ ان کی محنت، زر کی شکل میں تبدیل ہو کر مقامی اور بیرونی سرمایہ دار کے بینکوں اور حویلیوں میں منتقل کی جا رہی ہے۔ جب کہ مزدور کے لیے صرف بھوک رہ جاتی ہے۔

پاکستانی حکمران بھی اس روش میں اپنا پورا کردار ادا کر رہے ہیں اور مختلف مالیاتی بینکوں اور ڈبلیو ٹی او کی منفی پالیسیوں کو ہر طرح سے قبول کر کے عوام پر مسلط کرنے پر کوشاں ہیں۔ پچھلے ایک سال میں ڈیزل کی قیمت میں ۵۶ فیصد اضافہ، کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس کا نفاذ اور کپاس جیسی برآمدی فصلوں کی قابل کاشت اراضی کو بڑھانے کی کوششیں اس بات کا ثبوت ہے کہ حکمراں طبقے نے اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ نظام کی خدمت کے لیے مختص کر دیا ہے۔

کیرالہ، ہندوستان سے آنے والی رپورٹ جدید زرعی پیداواری طریقہ کار کے شدید نا قابل تلافی نقصانات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کاسارا گوڈ، کیرالہ میں انڈوسلفان جیسی کیڑے مار دوا کا ۲۵ سالہ ہوائی چھڑکاؤ کے نتیجے میں اس علاقے کے باشندے ذہنی اور جسمانی معذوری، کینسر اور کئی دیگر جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔ اس واقعہ کے اندوہناک نتائج ثابت کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ کمپنیاں منافع کے حصول کی خاطر کسی بھی گھناؤنے فعل سے گریز نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ عراق پر امریکی سامراجی حملے اور زراعت پر آزاد تجارت کی جنگ کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

عورتوں کے عالمی دن کی ایک تقریب میں عورتوں نے آزاد تجارت کے دونوں زاویوں کی سختی سے مخالفت کی اور پدرشاہی اور سرمایہ دارانہ نظام کے اندر سموئی ہوئی ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اگر اب بھی غیر ملکی سامراجی پالیسیوں کی شدت سے مخالفت اور مزاحمت نہ کی گئی تو پوری دنیا آزاد تجارت کی زر کی ہوس کا شکار ہو جائے گی۔

فہرست مضامین

زراعت: سال ۲۰۰۲ کا جائزہ 2
برطانوی راج، آزاد تجارت 16
زراعت کے لیے نئی عالمی حکمت عملی 6
بات تو سچ ہے مگر 21
اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ 9
رخ زمانہ 24
مزدور کسان عورت 13
عورتوں کا عالمی دن 27

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے ایچ بی ایف (Heinrich Boll Foundation) کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔113، بلاک 13- ڈی، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس 9267 497 21 92+ ای میل: roots@super.net.pk
فیلڈ یونٹ: پلاٹ نمبر 46 گلشن فیض-II، ٹنڈو محمد خان، فون 42373 224 92+

زراعت: سال ۲۰۰۲ کا جائزہ

سرتاج خان

سال ۲۰۰۲ پاکستان کے سب سے اہم پیداواری شعبے یعنی زراعت کے حوالے سے ملا جلا رہا۔ حکومتی حلقوں، بڑے جاگیرداروں اور پالیسی ساز افراد کے نزدیک اگرچہ زرعی شعبے کی کارکردگی بہت ہی زیادہ اچھی تو نہیں رہی مگر اسے بالکل خراب بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گندم جیسی اہم غذائی فصل برآمد کی جارہی ہے، گنا اور تمباکو کی فصلیں مقررہ پیداواری اہداف کو عبور کر گئیں۔[1] جبکہ کپاس کی فصل بھی تخمینوں کے مقررہ اہداف کے قریب ہے۔ البتہ دھان کی فصل پانی کی کمی اور حکومتی پالیسی کی زد میں آ کر کم پیدا ہوئی۔ زراعت میں ''خود کفالت'' کا سارا فائدہ صرف حکومت کو پہنچ رہا ہے۔ زرمبادلہ میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن دوسری طرف اسی عرصہ کے دوران غربت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ زرعی شعبے کو مزدور کسان کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو صورتحال انتہائی سنگین دکھائی دیتی ہے۔ حکومتی پالیسیوں کے باعث کسانوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے ملک خشک سالی کے نرغے میں رہا۔ دریا اور نہریں خشک ہوگئیں اور کھیتوں میں کھڑی فصلیں سوکھ گئیں۔ یہ صورتحال صوبہ سرحد اور پنجاب کی بہ نسبت بلوچستان اور سندھ میں زیادہ شدید تھی۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ موسمی تغیرات بھی ہماری ماحولیات کو نظر انداز کرنے والی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ جس میں جنگلات میں کمی، نقل وحمل اور صنعتوں کا پیدا کردہ غلاظت اور دھواں، زراعت میں نقد آور فصلوں کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے اراضی کے بڑے حصے پر ایک ہی فصل کی کاشت اور فصلوں کے لیے مصنوعی بیج، کھاد اور کیڑے مار ادویات کا بڑھتا ہوا استعمال قابل ذکر ہے۔ اس نقطہ نظر دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہماری موجودہ تباہی گزشتہ ۵۰ سال سے وضع کردہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔

خشک سالی اور قحط

پاکستان کی کل قابل کاشت اراضی میں سے ۱۷ء۵۸ ملین ہیکٹر رقبہ یا ۸۲ فیصد کا انحصار نہری نظام کے پانی پر ہے۔ جبکہ ۳ء۹۶ ملین یا ۱۸ فیصد اراضی بارانی ہے۔[2] اس طرح دونوں اقسام کی کاشتکاری کا انحصار بڑی حد تک بارش پر ہے۔ پچھلے سال خشک سالی کے باعث ۴۰ فیصد کم پانی فراہم کیا گیا۔[3] خشک سالی کے نتیجے میں صوبہ بلوچستان اور سندھ کی دیہی آبادی کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچستان کے پانچ اضلاع چاغی، خاران، پشین، قلعہ سیف اللہ اور قلعہ عبداللہ اور صوبہ سندھ کے بھی پانچ ہی اضلاع تھر پارکر، میر پور خاص، سانگھڑ، دادو اور ٹھٹہ شدید متاثر ہوئے۔ بلوچستان میں خشک سالی اور قحط کے نتیجے میں دمہ، ٹی بی اور جلدی امراض میں اضافہ ہوا۔ سب سے سنگین صورتحال ضلع چاغی کے دیہاتوں میں پائی گئی۔ خوراک کی شدید قلت کا یہ حال تھا کہ ایک پانچ سالہ بچہ اپنا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھا۔[4]

سندھ میں ضلع تھر پارکر سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہاں سے ۴۰ فیصد افراد نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ بارانی کھیتی باڑی اور گلہ بانی ان کے دو اہم ترین ذریعہ معاش ہیں۔ قحط کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ۶۵ فیصد مویشی آدھی قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور ہوئے۔ جبکہ روزگار کی تلاش میں ان کو دوسرے علاقوں کا رخ کرنا پڑا۔ اگرچہ حکومت نے خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کو آفت زدہ قرار دیا اور ان کے لیے امداد کا بھی اعلان کیا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ آفت زدہ علاقوں کے کسانوں سے اس دوران ٹیکس کی وصولی جاری رہی۔[5]

حکومت سندھ کی رپورٹ کے مطابق متاثرہ اضلاع میں تین ہزار کے قریب گاؤں کے ۸ء۱۳ لاکھ افراد اور تقریباً ۵۶ لاکھ مویشی خشک سالی سے متاثر ہوئے۔ متاثرین میں سے ۹۵ فیصد پہلے ہی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے تھے۔ سماجی تنظیموں کا خیال تھا کہ نقصانات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔[6]

سال ۲۰۰۲ کے دوران حکومت نے خشک سالی کے شکار ملک میں کھیتوں کو فراہم ہونے والے پانی کو نجی کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کا باقاعدہ اعلان کیا۔ عالمی بینک کے تعاون سے بننے والے اس منصوبے کو ''شراکتی آبپاشی کا انتظامی نظام'' کا نام دیا گیا ہے۔ حکومت کے اہلکاروں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس پر اگلے دسمبر سے عملدرآمد کیا جائیگا۔ اس نظام پر عملدرآمد کے لیے سب سے پہلے صوبہ سندھ کا انتخاب کیا گیا ہے[7] جو پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے۔ پانی نجی کمپنیوں کے حوالے کرنے کا مقصد پانی کے نرخوں میں مزید اضافہ ہے۔ اس طرح ''کم پانی، زیادہ قیمت'' کا سرمایہ دارانہ اصول یہاں پوری طرح کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس سے کسانوں کی پیداواری لاگت مزید بڑھے گی۔ دوسری طرف حکومت سندھ نے کسانوں سے ٹیکس کی وصولی کو یقینی بنانے کے لیے ایک خصوصی ٹاسک فورس بھی قائم کی۔

فوجی حکومت ملک میں جدید زرعی سرمایہ دارانہ طرز پر کاشتکاری کو فروغ دینے کے لیے گزشتہ تین سال سے مصروف عمل تھی۔ اس طرز کاشتکاری کا مطالبہ بین الاقوامی مالیاتی ادارے ایک مدت سے کر رہے تھے۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے بجٹ کے فوراً بعد ۱۹ جون ۲۰۰۲ کو کارپوریٹ فارمنگ کی باقاعدہ منظوری دے دی۔

اب ہر بین الاقوامی یا مقامی کمپنی ملک میں کاشتکاری کر سکتی ہے۔ حکومت نے اس ضرورت کے پیش نظر کارپوریٹ فارمنگ کو ملک میں کمپنیوں کے لیے قوانین کے ایک ضابطے مجریہ ۱۹۸۴ کے تحت ایسا کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی کمپنی جتنی چاہے زمین حاصل کر لے۔

حکومت نے کارپورٹ فارمنگ کی منظوری کے ساتھ ہی ضروری اقدامات کی طرف پیش قدمی تیز تر کردی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ملک بھر میں صنعتی ایکسپورٹ زونوں کے طرز پر زرعی ایکسپورٹ پروسسنگ زون کا قیام ہے۔ حکومت سندھ نے کراچی میں سپر ہائی وے پر اسی قسم کے ایک زون کے لیے ۱۸۰ بلین روپے مختص کیے ہیں۔[۸] اسی طرح کے مزید اقدامات کرتے ہوئے پرانے قوانین کو ''نئی ضروریات'' سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ زرعی اصلاحات، سندھ میں مزارعین کے آرڈیننس اور مزدور قوانین میں ترامیم کیے گئے ہیں۔ کارپورٹ فارمنگ اسکیم کے پیش نظر حکومت نے زرعی سرمایہ کاری کے لیے جہاں اپنی پالیسیاں عالمی قوانین سے ہم آہنگ کیں، وہاں غیر ملکی زرعی کمپنیوں کے لیے پہلے مختلف سرکاری محکموں کے تحت آنے والی زمینیں دینے کی منصوبہ بندی کرنے کے ساتھ مزارعین کے خلاف محاذ کھول دیا ہے۔

صوبہ پنجاب میں کئی اضلاع پر پھیلے ہوئے مختلف تحقیقی اداروں اور فوج کی زمین کسان گزشتہ ایک صدی سے کاشت کرتے آرہے ہیں۔ اور یہی زمین حکومت کسانوں سے لے کر بڑی بڑی زرعی کمپنیوں کے حوالے کرنے پر تلی ہوئی ہے جس پر ہزاروں مزدور کسانوں نے قبضہ کرکے اپنی ملکیت کا اعلان کردیا۔ مزدور کسان اوکاڑہ، ساہیوال، خانیوال، سرگودھا اور ملتان کے اضلاع میں انجمن مزارعین پنجاب کے جھنڈے تلے متحد ہوکر حکومتی جبر کا مقابلہ کررہے ہیں۔

انجمن مزارعین کی موجودہ جدوجہد، فوجی حکومت کے خلاف سب سے بڑی عوامی تحریک بن کر سامنے آئی ہے۔ فوجی حکومت نے تقریباً تمام آزمودہ نسخے ازماڈالے ہیں لیکن پولیس، رینجرز اور عدالتوں کے زور پر وہ اب تک زمینیں حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ ریاستی اداروں نے ظلم و جبر کے زور پر سینکڑوں افراد کو مارا پیٹا اور جیلوں میں بند کیا اور بعض کو جان سے مارڈالا۔ فوجی حکومت نے اپنے تین سالہ دور حکومت میں جو بے شمار عوام دشمن اقدامات کیے ان میں سے کارپوریٹ فارمنگ کو دیہی آبادی، کسان اور ملکی زراعت کے ضمن میں سب سے زیادہ عوام دشمن پالیسی قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

چند اہم زرعی فصلیں

کپاس کئی حوالوں سے ملکی اور زرعی معیشت کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ کپاس ایک اہم نقد آور فصل ہونے کی وجہ سے زرمبادلہ کے حصول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور ملک کی کپڑے کی صنعت کے لیے بھی یہ خام مال کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے۔

اسے دوسرے حوالوں سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ زرعی کاروبار کرنے والی کمپنیوں کی اس فصل پر خاص نظر مرکوز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کپاس کے بیج، اس میں استعمال ہونے والی کھاد اور سب سے بڑھ کر اس پر چھڑکائے جانے والی کیڑے مار ادویات کے استعمال سے حاصل ہونے والے منافع کیمیائی کمپنیوں کے لیے نہایت اہم ہے۔ پاکستان میں مجموعی طور پر استعمال ہونے والی کیڑے مار ادویات میں سے ۵۴ فیصد صرف کپاس پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس سال پنجاب اور سندھ میں کپاس کی فصل پر وائرس کا حملہ ہوا۔ ماہرین نے مشورہ دیا تھا کہ پت جھڑ وائرس سے متاثرہ پودے کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ وائرس ۱۹۸۰ کی دہائی کے بعد دوبارہ رونما ہوا[۹] کپاس کی فصل کی دیکھ بھال کرنے والی کاٹن کروپ منجمنٹ کمیٹی نے کئی ایک کیمیائی ادویات کو ''مزید موثر'' بنانے کے لیے ان کی طاقت بڑھانے کی سفارش کی۔ کمیٹی کے مطابق ادویات میں استعمال ہونے والا زہر غیر موثر ہوگیا ہے جس سے کیڑے نہیں مرتے۔[۱۰]

کیڑے مار ادویات کے غیر موثر ہونے کی اطلاعات وقفہ وقفہ سے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیڑے کچھ ہی عرصہ بعد ان کے خلاف مدافعت پیدا کرلیتے ہیں۔ اس لیے آنے والی نسلوں پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ حکومتی ماہرین اور کیڑے مار ادویات کے نزدیک اس کا ایک ہی حل ہے کہ زہر کو مزید طاقتور بنایا جائے اور اس پر عمل بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن پھر کچھ ہی عرصہ بعد یہ زہر بھی غیر موثر ہونے لگتا ہے اور یوں یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ اس پالیسی کا اثر عوام اور ماحول پر پڑتا ہے۔ کپاس کی فصل میں گوڈی اور چنائی کرنے والے مزدور کسان مرد اور عورتیں سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماحول میں قدرتی تنوع بھی متاثر ہوتا ہے۔ کسانوں کو طاقتور زہر خریدنے پر زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنیوں کے منافع جات میں مزید اضافہ ہونے لگتا ہے۔ غریب دیہاتیوں کو اس زہر کے منفی اثرات کے علاج کے لیے اپنے اور اپنے خاندان پر مزید رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ کیڑے مار ادویات اور بیج تیار کرنے والی ایک کمپنی مونسانٹو نے حکومت سے کہا ہے کہ اسے ملک کے اندر جینیاتی کپاس کے بیج فروخت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح حکومت اور نجی شعبہ دونوں کی طرف سے کپاس کی پیداوار بڑھانے پر خصوصی زور دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو کپاس کے زیر کاشت رقبہ کو بڑھانا اور دوسرا اس کے معیار کو بہتر بنانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سال ۲۰۰۲ کے دوران وہ تمام اقدامات کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی جو کپاس کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کے لیے ناگزیر تھے۔ روایتی طور پر کپاس کی فصل سندھ اور پنجاب میں کاشت کی جاتی ہے۔ لیکن اس سال سرحد اور بلوچستان دونوں صوبوں میں تقریباً ۸۰ ہزار ایکڑ رقبہ پر کپاس کی منصوبہ بندی کی گئی تھی جس میں بیجوں کی سستی فراہمی اور دیگر مراعات شامل ہیں۔[۱۱]

حکومت نے کپاس کے ایک خاص معیار کو حاصل کرنے کے اقدام کے طور پر ۱۷، اگست ۲۰۰۲ کو ایک پالیسی کا اعلان کیا اور بعد ازاں ۶ ستمبر ۲۰۰۲ کو ایک صدارتی آرڈیننس جاری کیا، جس کا مقصد ملک میں عمدہ کپاس کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ملک میں ایک ادارہ کے قیام کا بھی اعلان کیا گیا۔ تمام حکومتی اثرات کا اثر یہ پڑا ہے کہ کپاس کی پیداوار خشک سالی کے باوجود تسلی بخش ہونے کی اطلاعات ہیں۔ اس سال کپاس کی فصل سندھ میں پنجاب سے زیادہ پیدا ہوئی۔ حکومت نے ۱۳

جون کو کپاس کی فصل کے لیے امدادی قیمت کا اعلان کرتے ہوئے ۸۰۰ روپے فی ۴۰ کلوگرام مقرر کیے گئے۔ جو پچھلے سال سے صرف ۲۰ روپے زیادہ ہے۔[۱۲] اس کے برعکس امریکہ میں کپاس اگانے والے کسانوں کو بہت بڑی امداد ملتی ہے مثلاً امریکہ میں صرف ۲۵ ہزار کپاس اگانے والے سرمایہ دار کسان ہیں جنہیں سالانہ اوسطاً ۸ لاکھ ڈالرز ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کو ہر سال ان کسانوں کی امداد پر ۹ء۳ بلین ڈالرز خرچ کرنے پڑتے ہیں۔[۱۳]

سال ۲۰۰۲ کے عالمی سطح پر کپاس کی فصل کے متاثر ہونے کی وجہ سے امید کی جارہی ہے کہ پاکستانی کپاس کے اچھے دام ملیں گے۔ لیکن اس کا فائدہ کسانوں کے بجائے ان لوگوں کو ہوگا جنہوں نے ان سے کپاس خریدی ہے۔ اس طرح عالمی قیمتوں میں اونچ نیچ کا فائدہ بیوپاریوں کو ہوتا ہے جبکہ نقصان ہر صورت میں صرف کسان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سال ۲۰۰۲ کے دوران سندھ کے کاشتکاروں اور شکر کے کارخانہ داروں کے درمیان نرخ پر رسہ کشی جاری رہی۔ حکومت نے مختلف طریقوں سے شکر سازی صنعت کا ساتھ دیا۔ مل مزدوروں اور مزدور کسان نے بھی کاشتکاروں کا ساتھ دیتے ہوئے ریلوے لائن اور مرکزی شاہراہیں بند کرڈالیں۔ حکومت کی بے اثری اور دوغلے پن کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۴۳ روپے فی من (۴۰ کلوگرام) نرخ مقرر کرنے کے باوجود اسے لاگو کرنے میں ناکام رہی۔ حکومت کی بار بار کی تنبیہ اور عدالتی کاروائی کا بھی صنعت کاروں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ کارخانے چلانے میں ٹال مٹول کرتے رہے لیکن اس سے غریب کسان بری طرح متاثر ہوئے۔ گنے کی فصل تقریباً ایک سال کے عرصے میں تیار ہوتی ہے اور اکتوبر کے قریب کٹنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ لیکن زیریں سندھ میں مارچ کے اختتام تک کھیتوں میں فصل نظر آئی ہے۔ سندھ میں جو کاشتکار گنے کے بعد اپنی زمینوں پر گندم کاشت کرنا چاہتے تھے انہیں بوائی میں تاخیر کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

گندم، ملکی عوام کے خوراک کا اہم ذریعہ ہے اور اسی حوالے سے تحفظ خوراک میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کی پیداوار اور غذائیت میں کمی ہر حوالے سے تحفظ خوراک کو متاثر کرتی ہے۔ پاکستان ۲۰۰۰ سے گندم میں خودکفیل ہوا ہے ورنہ ملکی ضروریات پوری کرنے کے لیے گندم درآمد کی جاتی تھی۔ لیکن ایشیائی ترقیاتی بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ملک کو ایک مرتبہ پھر گندم کا محتاج بنانا چاہتی ہیں اور اسی حوالے سے کاشتکاروں کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے۔

اس سال گندم کی پیداوار میں ۹ء۲ اور فی ایکڑ رقبہ میں ۵ء۰ فیصد کم پیداوار کا اندازہ لگایا گیا۔ حکومت نے اس سال گندم کی امدادی قیمت پھر ۳۰۰ روپے مقرر کی ہے جو تین سال قبل مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران پیداواری لاگت میں کئی گنا اضافہ ہوا کیونکہ تیل کی قیمتوں میں ۱۰۰ فیصد سے زیادہ بڑھی ہیں۔ کھاد اور کیڑے مار ادویات پر جنرل سیلز ٹیکس اور زرعی ٹیکس کا نفاذ عمل میں آیا جبکہ ۲۵ فیصد سالانہ کے حساب سے آبیانہ بڑھایا گیا۔ خشک سالی کے باعث ٹیوب ویل سے رجوع کرنے والوں کو بجلی کے زیادہ شرح سے نرخ دینے پڑے۔[۱۴] کسان کی صحت، خوراک اور نقل وحمل پر اخراجات بڑھ گئے لیکن گندم کی امدادی قیمت گزشتہ تین سال سے ۳۰۰ روپے ہی ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے ساتھ معاہدے کے پیش نظر حکومت نے بہت محدود پیمانے پر گندم کی خریداری کی اور قصداً خریداری مراکز بند کردیے نتیجہ یہ نکلا کہ کسان بیوپاریوں کے ہاتھوں لٹ گئے۔ پورے ملک میں گندم سرکاری نرخ سے کم پر خریدی گئی۔ حکومت نے نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے لیے کروڑوں روپے کے قرضے جاری کیے۔ اس دوران حکومت کبھی باردانہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی اور کبھی سرکاری افسران کو خریداری کم کرنے اور اقرباء پروری پر موردالزام ٹھہراتی رہی۔ ظاہر ہے جب حکومت خود ہی فیصلہ کرتی ہے کہ گندم کم خریدنا ہے تو پھر سرکاری افسران لازمی طور پر بڑے جاگیرداروں اور بااثر افراد کو عام کسان پر فوقیت دیں گے۔

گندم کی طرح چاول بھی ایک اہم غذائی فصل ہے۔ لیکن حکومت کو صرف دھان کے اعلیٰ اقسام مثلاً باسمتی کی پیداوار سے غرض ہے کیونکہ اس سے زرمبادلہ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دھان کی وہ قسمیں، جو ملکی عوام کے استعمال میں آتی ہیں، ان کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ملک میں پاکستان رائس بورڈ کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔ بورڈ کے قیام کا مقصد دھان کی فصل کے معیار، تحقیق و ترقی، فروخت اور برآمد کو فروغ دینا ہے۔ پانی کی کمی اور ''کپاس زیادہ اگاؤ'' پالیسی کے نتیجے میں دھان بری طرح متاثر ہوا۔ رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کے چیئرمین نے بتایا کہ سال ۲۰۰۲ میں چاول کی پیداوار پہلے کے مقابلے میں دس لاکھ ٹن کم ہوئی۔[۱۵] چاول کی پیداوار میں ۲ء۱۹ فیصد اور زیر کاشت رقبے میں ۱ء۱۱ فیصد کمی واقع ہوئی۔ لیکن جو فصل کسانوں کو تمام مشکلات کے بعد حاصل ہوئی اس کے بھی مناسب دام نہیں مل سکے۔ قلت آب اور حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے سندھ کے صرف ایک تعلقہ فاضل راہو میں کسانوں کو ۲۵ کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔[۱۶] حکومت کا کسانوں کو منڈی کے رحم وکرم پر چھوڑنے کے بعد کسانوں کو آڑھتیوں کے ہاتھوں لٹنے کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کے باعث دھان کی قیمت ۴۰ روپے فی بوری کم ملے۔[۱۷]

اس سال پیاز، ٹماٹر جیسی فصلیں اگانے والے کاشتکار بھی منڈی کی مندی کے شکار ہوئے۔ پیاز کی قیمتوں میں اس قدر کمی ہوئی کہ ۱۲۰ بوری ٹرک کی قیمت بمشکل ۲۰,۰۰۰-۱۵,۰۰۰ روپے مقرر ہوئے۔[۱۸]

زیریں سندھ کے اضلاع میرپور خاص، تھرپارکر، سانگھڑ اور بدین میں ٹماٹر کی کاشتکاروں کو بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑا۔[۱۹] مثلاً ضلع میرپور خاص کے ایک سب ڈویژن میں اچھی فصل ہونے کے باوجود منڈی سے مناسب دام نہیں مل سکے۔ ۳۰۰-۲۰۰ روپے میں فروخت ہونے والی ٹماٹر کی ایک پیٹی کے نرخ اس سال ۲۰-۱۵ روپے مقرر ہوئے۔ جبکہ میرپور خاص سے ٹماٹر فروخت کرنے کی خاطر حیدرآباد کی منڈی تک پہنچانے پر ۲۵ روپے فی پیٹی خرچہ آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسانوں کی محنت اور منافع تو ایک طرف ان کی فصل پر پیداواری لاگت بھی پوری نہیں ہوسکتی۔ ان حالات میں کسانوں نے ٹماٹر کے فصل کو ضائع کرکے اس پر گندم اگانے کے لیے

ہل چلا کر زمین ہموار کر دی۔[20]

جب ملک بھر کے کسانوں کو خشک سالی اور قحط کے باعث بھوک و افلاس کا سامنا تھا اور ملک کی ۷۰ فیصد دیہی آبادی قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی تو زرعی کاروبار سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ کمپنیوں کے منافع جات میں اضافہ ہوتا رہا (ٹیبل ۱)۔ شیل تیل کی ایک بین الاقوامی کمپنی ہے۔ اس کمپنی کے آدھے سال کا منافع ۸۴۸ ملین روپے تھا۔[21] یوریا بنانے والی کمپنیوں اینگرو کیمیکل اور فوجی فرٹیلائزر کے منافع جات بھی بڑھے ہیں۔ یہ دونوں ملک میں ۷۰ فیصد کھاد کی فراہمی کے ذمہ دار ہیں۔ اینگرو یوریا کی پیداوار اس عرصہ میں ۱۸ فیصد اور مجموعی فروخت ۳۶ فیصد کے حساب سے بڑھی۔[22]

توانائی کے نرخوں میں اضافے کی اہم وجہ کمپنیوں کا منافع اور حکومت کا ٹیکس ہے۔ زرعی شعبے پر اثر انداز ہونے والے توانائی کے ذرائع میں تیل، بجلی اور گیس اہم ترین ہیں۔ ان میں معمولی اتار چڑھاؤ بھی پیداواری لاگت کو متاثر کرنے کا سبب بنتی ہے۔

حکومت نے عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے پیش نظر توانائی پر ہر قسم کے سرکاری کنٹرول کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے حکومت کو دو اہم فائدے حاصل ہوئے۔ حکومت عوامی دباؤ سے آزاد ہوگئی ہے اور نرخوں کو عالمی منڈی کی قیمتوں سے جوڑتے ہوئے اسے ایسے خود مختار اداروں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے جو عوامی مفاد کے بجائے، (ان کے کہنے کے مطابق) تکنیکی بنیادوں پر فیصلے کرتے ہیں کیونکہ انہیں عوام کے سامنے جوابدہی یا ان سے ووٹ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی!

سال ۲۰۰۲ سے قبل تیل کی کمپنیاں ایک ٹن تیل پر ۱۵۹ روپے لیتی تھیں۔ عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت جنوری ۲۰۰۲ سے ان کمپنیوں کو ۳ فیصد سے لیکر ۵ء۵ فیصد تک اپنے منافع رکھنے کی اجازت دی گئی۔ نتیجہ عوام کے بوجھ اور تیل کی کمپنیوں کے منافع جات میں اضافہ ہے مثلاً تیل کی تجارت کرنے والی کمپنیوں کا منافع ۷۰۰ ملین سے بڑھ کر ۲ بلین روپے ہوگیا۔[23] تیل کی قیمتوں میں اضافہ کرنے والا دوسرا عنصر حکومتی ٹیکس ہے۔ حکومت نے بجٹ میں آئی ایم ایف کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے تحت تیل پر ۵ء۴۵ بلین روپے اور گیس پر ۱۵ بلین روپے کا ٹیکس لگایا۔

پاکستان میں ۵ء۱۲ ملین چھوٹے کاشتکار گھرانے ہیں جن میں ۷۵ فیصد نظر انداز کیے گئے کسان ہیں جو ایک ہیکٹر زمین یا اس سے کم کے مالک ہیں۔[24] یہ لوگ زیادہ تر اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر چاول اور گندم کاشت کرتے ہیں۔ یہی لوگ حکومت کی آزاد معیشت پالیسیوں سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

حکومت ہر گزرتے دن کے ساتھ عوام کی تعلیم، صحت اور عوامی بہبود کے دیگر شعبوں سے ہاتھ کھینچتے ہوئے نجی شعبے کو آگے لانے میں مصروف ہے۔ تیل، گیس، بجلی، کیڑے مار ادویات، کھاد اور بیج کی قیمتوں میں آئے دن اضافے اور امدادی قیمتوں اور مراعات کے خاتمے کے نتیجے میں غربت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے نمائندے کے بقول پاکستان کی آدھی آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتی ہے۔ انہوں نے ملک کے دیہی علاقوں میں بڑھتی ہوئی غربت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے زرخیز خطے جنوبی پنجاب، اندرون سندھ اور صوبہ بلوچستان غربت کے سب سے زیادہ شکار علاقے ہیں۔[25]

ٹیبل: ۱

کمپنی	دورانیہ (سال ۲۰۰۲)	منافع
شیل	ششماہی (جولائی۔دسمبر)	۸۴۸ ملین روپے
حب کو	ششماہی (جولائی۔دسمبر)	۲ء۹ بلین روپے
اینگرو کیمیکل	سات ماہ	۸۵۴ ملین روپے
فوجی فرٹیلائزر	پورا سال	۱ء۳ بلین روپے

پاکستانی حکمراں طبقہ کو غربت میں اضافے سے کوئی خاص غرض نہیں ہے کیونکہ ان کا مفاد عالمی مالیاتی و تجارتی اداروں سے وابستہ ہے۔ براہ راست فوجی حکومت کے تین سالہ دور کے بعد ایک نئی شکل میں اس کا تسلسل اکتوبر ۲۰۰۲ میں ہونے والے انتخابات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئی ایم ایف، عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک کی پالیسیوں پر عمل پیراء ہونے کی اندرون خانہ یقین دہانیوں اور بار بار کے اعلانات کے ساتھ ساتھ ان کے منظور نظر افراد کو نام نہاد جمہوری حکومت میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ عوامی بھلائی کی کوئی امید موجودہ حکومت سے وابستہ کرنا عبث ہوگا۔ ان حالات میں عوامی جدوجہد کی مقامی اور عالمی تحریکوں کا حصہ بن کر ہی اس نظام کے خلاف کوئی مزاحمت کی جاسکتی ہے۔ انجمن مزارعین کی ''مالکی یا موت'' اسی قسم کی ایک مقامی تحریک ہے جبکہ عالمی سطح پر گلوبلائزیشن مخالف اور سرمایہ داری مخالف تحریک اس کی مثالیں ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ مختلف فصلوں کے لیے دیکھیے: جنگ، ۲۷، اکتوبر ۲۰۰۲، دی نیوز، ۲۸، جولائی ۲۰۰۲ دی نیوز، ۲۷، جنوری ۲۰۰۳، ڈان، ۱۷، ستمبر ۲۰۰۲

۲۔ ڈان، ۹، ستمبر ۲۰۰۲

۳۔ ڈان، ۲۲، مارچ ۲۰۰۲

۴۔ ڈان، ۱۴، دسمبر ۲۰۰۲

۵۔ ڈان، ۱۹، جولائی ۲۰۰۲ اور ۲۵، جولائی ۲۰۰۲

۶۔ جنگ، ۲۶ نومبر ۲۰۰۲

۷۔ دی نیوز ۹ جون ۲۰۰۲

۸۔ دی نیوز، ۱۸، دسمبر ۲۰۰۲

۹۔ جنگ، ۱۱، ستمبر ۲۰۰۲

۱۰۔ ڈان، ۱۹، اگست ۲۰۰۲

۱۱۔ ڈان، ۱۴، اگست ۲۰۰۲

۱۲۔ ڈان، ۱۳، جون ۲۰۰۲

۱۳۔ دی ہیرالڈ نومبر ۲۰۰۲

۱۴۔ دی نیوز، ۲۷، جنوری ۲۰۰۳

۱۵۔ جنگ ۳۰ اگست ۲۰۰۲

۱۶۔ جنگ، ۱۷، دسمبر ۲۰۰۲

۱۷۔ جنگ، ۱۸، دسمبر ۲۰۰۲

۱۸۔ ڈان، ۲۳، دسمبر ۲۰۰۲

۱۹۔ جنگ، ۳، نومبر ۲۰۰۲

۲۰۔ جنگ، ۱۷، نومبر ۲۰۰۲

۲۱۔ ڈان، ۲۸، جنوری ۲۰۰۲

۲۲۔ ڈان، ۲۳، اکتوبر ۲۰۰۲ اور ۳۰، جنوری ۲۰۰۲

۲۳۔ ڈان، ۲۷، دسمبر ۲۰۰۲

۲۴۔ ڈان، ۱۳، جنوری ۲۰۰۳

۲۵۔ دی نیوز، ۲۴ جنوری ۲۰۰۳

زراعت کے لیے نئی عالمی حکمت عملی:

تیسری دنیا کی زرعی معیشت اور مزدور کسانوں کی تباہی کی نوید

ولی حیدر

زراعت آجکل دو حوالوں سے زیر بحث ہے۔ ایک ریاستوں کے تشکیل کردہ ادارے خاص کر کے ورلڈ ٹریڈ آرگنائیزیشن (ڈبلیو ٹی او) اور دوسری طرف عوامی حلقے اور تنظیمیں ہیں اس میں سرمایہ دارانہ مخالف تحریک اور ورلڈ سوشل فورم قابل ذکر ہیں۔

۲۰۰۲ کے ڈبلیو ٹی او کے دوہا وزارتی اجلاس کے موقع پر ''دوہا وزارتی دستاویز'' تیار کی گئی تھی۔ جس میں آزاد تجارت کے حوالے سے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ زراعت کے حوالے سے رکن ممالک کو درپیش مشکلات اور شکایت کے ازالے کے لیے تجاویز پیش کی گئی تھیں۔

''دوہا وزارتی دستاویز'' پیراگراف ۱۳ اور ۱۴ میں واضح طور پر اسکا ذکر موجود ہے۔

پیراگراف ۱۳: ''ہم ایک مرتبہ پھر طویل مدت مقاصد کے حوالے سے معاہدے میں منصفانہ اور منڈی کی طرف جھکاؤ رکھنے والے تجارتی نظام کو بنیادی اصلاحات کے پروگرام کی مدد اور تحفظ، مضبوط قوانین اور خصوصی وعدوں کے ذریعے سے احاطہ کریں تاکہ عالمی زرعی منڈی میں پابندیوں کو روکنے اور بگاڑ کو درست کرنے کے لیے اقدامات کیے جاسکیں۔ ہم اس پروگرام کی تجدید کا عہد کرتے ہیں''۔

دستاویز میں یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ زرعی بات چیت درج ذیل امور کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھائی جائے گی۔

۱۔ منڈی تک رسائی میں خاطر خواہ اضافہ

۲۔ برآمدی مراعات میں کمی (مکمل خاتمے کو مدنظر رکھتے ہوئے)

۳۔ مقامی امدادی سہولیات میں خاطر خواہ کمی، جو کہ تجارت کے تباہی کا باعث ہیں۔

پیراگراف ۱۴: ''زراعت کے حوالے سے ایک مکمل لائحہ عمل ۳۱، مارچ ۲۰۰۳ تک تیار کیا جائے گا۔ رکن ممالک اس لائحہ عمل کے روشنی میں ایک جامع دستاویز اگلے وزارتی اجلاس میں پیش کریں''۔[۱]

اوپر دیے گئے پس منظر میں ۱۷ فروری ۲۰۰۳ کو اسٹیورٹ ہارنسن، چیئرمین زرعی کمیٹی، ڈبلیو ٹی او نے اپنی تیار کردہ جامع زرعی دستاویز جاری کی۔ یاد رہے کہ اس دستاویز کو آئندہ ہونے والی پانچویں وزارتی اجلاس، جو کہ میکسیکو کے شہر کینکون میں ستمبر ۲۰۰۴ میں منعقد ہوگی، زرعی اصلاحات کی بات چیت کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اس لیے دنیا کے تمام ممالک اور خاص کر ترقی پزیر ممالک کو حالیہ دستاویز میں تجویز کی گئی اصلاحات اور اس کے مختلف نکات جاننے اور سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔

دستاویز میں موجود چند اہم اصلاحات درج ذیل ہیں:

۱۔ زرعی محصولات میں ۲۵ فیصد سے ۴۵ فیصد تک کٹوتی، اس طرح اوسطاً ۴۰ فیصد سے ۶۰ فیصد تک کٹوتی

۲۔ ترقی یافتہ ممالک کے لیے برآمدی مراعات میں ۵ سال کے دوران ۵۰ فیصد تک کٹوتی اور بقیہ ۵۰ فیصد کا اگلے ۹ سال تک مکمل خاتمہ

۳۔ زرعی معاہدہ (اے او اے) کے ضمیمہ-۲ میں موجود گرین بکس کی اہمیت اسی طرح برقرار رہے گی جبکہ زرعی معاہدے کے دفعہ-۶٫۵ میں موجود بلیو بکس میں دیے گئے مراعات کی اگلے ۵ سال میں ۵۰ فیصد تک کٹوتی جبکہ بقیہ ۵۰ فیصد ہمیشہ برقرار رکھنا

۴۔ ترقی پزیر ممالک کو یہ موقع فراہم کرنا کہ وہ اپنے غذائی خود کفالت کے لیے ایسے زرعی اجناس کا انتخاب کریں جو ان کے تحفظ خوراک کے ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ ایسی فصلوں کو اہم مقاصد کے لیے شمار کی جانے والی پیداوار یعنی ''اسٹراٹیجیکل مصنوعات'' کا نام دیا گیا ہے۔

حالیہ پیش کردہ زرعی دستاویز دوہا وزارتی اجلاس میں کیے گئے وعدوں کی سراسر نفی کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں کہا گیا تھا کہ اصلاحات کے ذریعہ منصفانہ زرعی تجارت کو فروغ دیا جائے گا۔ موجودہ زرعی تجاویز میں منڈی تک رسائی کے حوالے سے جو غیر منصفانہ تجویز پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی محصولات میں کٹوتی کے طریقہ کار کو نہیں چھیڑا گیا جس کی وجہ سے ترقی پزیر ممالک حالیہ اصلاحات کے بعد بھی منڈی تک رسائی سے قاصر رہیں گے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک کے لیے یکساں محصولات میں کٹوتی کی تجویز انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زرعی معاہدے کے عمل درآمد سے پہلے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے محصولات میں بہت زیادہ اضافہ کیا تھا مثال کے طور پر اس وقت ترقی یافتہ ممالک نے گندم پر ۲۱۴ فیصد جبکہ ترقی پزیر ممالک نے ۹۴ فیصد محصولات عائد کر رکھے تھے ان ہی اعداد و شمار کے بنیاد پر زرعی معاہدے میں تجویز کردہ کٹوتی ہوگی۔[۲]

اوپر دیے گئے اعداد و شمار کی روشنی میں چیئرمین زرعی کمیٹی کی تجویز کردہ زرعی محصول میں کٹوتی ترقی پزیر ممالک کو کسی قدر چھوٹ دینے سے قاصر ہے۔ اگر منصفانہ اصولوں کے تحت دیکھا جائے تو یہ تجویز کیا جانا چاہیے تھا کہ چونکہ ترقی یافتہ ممالک معاشی طور پر انتہائی مستحکم ہیں وہ اپنے ملکوں میں محصولات کو یکسر ختم کریں اور ترقی پزیر ممالک اپنے مقامی تحفظ خوراک اور زرعی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے

اپنے طور پر محصول عائد کریں۔لیکن ایسی کسی تجویز کو قابل غور نہیں سمجھا گیا ہے۔

دوسری اہم تجویز برآمدی مراعات میں کمی کے حوالے سے ہے، جس میں ترقی یافتہ ممالک کے لیے مراعات میں ۵۰ فیصد تک کٹوتی تجویز کی گئی ہے اور وہ بھی پانچ سال کے عرصہ کے دوران۔ یہ تجویز بھی ترقی پزیر ممالک کے لیے غیر منصفانہ ہے کیونکہ ترقی پزیر ممالک اپنے ملکی معاشی ابتری اور بدحالی کی وجہ سے برآمدی مراعات دینے کے قابل نہیں، جبکہ دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک جن کے پاس وسائل کا ایک ناختم ہونے والا ذخیرہ ہے، اپنی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کو خطیر برآمدی مراعات دیتے ہیں تا کہ دنیا کے ہر خطہ اور منڈی پر ان کی اجارہ داری برقرار رہے اور پوری دنیا صرف خریدار بن کر رہ جائے۔

ترقی یافتہ ممالک کی برآمدی مراعات کی وجہ سے اخراجات میں بہت کمی واقع ہوتی ہے اور اس طرح وہ سستی قیمت پر اشیاء منڈی میں بیچنے کے قابل ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تیسری دنیا کے ملکوں کے لیے عالمی منڈی میں منصفانہ اور آزادانہ پہنچ کو ناممکن بنادیا گیا ہے۔

ڈبلیوٹی او کے زرعی معاہدے میں نئے تجاویز کی مخالفت میں ہونے والا مظاہرہ

تیسری اور اہم ترین تجویز مقامی مراعات کے حوالے سے ہے۔ پہلے کے مقابلے میں کسی تبدیلی کی گنجائش تک کو محسوس نہیں کیا گیا۔ تجویز کیا گیا ہے کہ مقامی مراعات کے حوالے سے گرین بکس (جو کہ تیسری دنیا کے ملکوں کے لیے معاشی میدان میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے) میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی جبکہ بلیو بکس میں پانچ سال کے دوران نصف کٹوتی تجویز کی گئی ہے۔ یہاں گرین بکس اور بلیو بکس کو سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ مقامی مراعات اور سہولیات کے حوالے سے تجاویز اور کسانوں کو دی گئی سہولیات اور پابندیوں کو اسی میں بیان کیا گیا ہے۔

گرین بکس:

ڈبلیوٹی او کے زرعی معاہدے کے گرین بکس میں کہا گیا ہے کہ حکومتیں کسانوں کو براہ راست رقم فراہم کرنے کی صورت میں مدد دے سکتی ہیں اور اس طرح کی مدد آزاد تجارت کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔

یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا تیسری دنیا کے ممالک معاشی طور پر اس قدر مستحکم ہیں کہ وہ اپنے کسانوں کو براہ راست رقم فراہم کرسکیں؟

گرین بکس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکومتیں تحفظ خوراک، لوگوں کے لیے غذائی ذخیرہ اندوزی اور مقامی غذائی امداد جیسے عوامی فلاح و بہبود کے حکمت عملیوں پر بھی عمل پیرا ہوں۔اس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یہ ممالک قرضہ عالمی مالیاتی اداروں مثلاً آئی ایم ایف، عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک سے وصول کرتے ہیں۔ان قرضوں کو دیتے وقت مقروض ممالک کو پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنی معاشی پالیسی اس طرح مرتب کریں کہ قرضہ واپس کرسکیں۔ان معاہدوں کے تحت، زرعی شعبوں میں دی جانے والی مراعات کے علاوہ عوامی فلاح و بہبود کے مختلف شعبوں مثلاً تعلیم، صحت وغیرہ کے شعبوں سے بھی حکومتی مراعات کو ختم کردی جاتی ہیں، کیونکہ حکومتیں مجبور ہوتی ہیں کہ وہ عالمی اداروں کے ان غیر منصفانہ شرائط پر بلاچوں و چراں عمل کریں۔ پاکستان میں بجلی، گیس، مختلف زرعی فصلوں میں استعمال ہونے والی اشیاء مثلاً بیج اور کھاد پر سے اسی پالیسی کے تحت حکومتی مراعات ختم کردی گئی ہیں۔

بلیو بکس: ڈبلیوٹی او کے زرعی معاہدے کے بلیو بکس میں بھی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کو فائدہ پہچانے کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ حکومتیں کسانوں کو مقرر کردہ زمین، مال مویشی اور دیگر زرعی اشیاء کے لیے براہ راست امدادی رقم فراہم کرسکتی ہیں۔

یہاں بھی ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ پاکستان جیسے ممالک اپنی انتہائی کمزور معاشی حیثیت اور عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت بلیو بکس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور نتیجہ میں حکومتی سرپرستی اور امداد کے بغیر تیسری دنیا کے مزدور کسان اپنے آپ کو بے بس اور لاچار پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جو کاشت کرتے ہیں اسے خود کھانے سے محروم ہیں۔

چیئرمین زرعی کمیٹی کے مسودہ پر تنقید ابھی جاری ہے اور ممبر ممالک کسی حتمی نتائج تک پہنچنے میں ناکام ہوگئے ہیں۔مسودہ پر تجاویز اور اسے حتمی شکل دینے کی آخری تاریخ ۳۱، مارچ ۲۰۰۳ تھی اور مقررہ تاریخ کے اختتام تک بھی ممبر ممالک کے درمیان اتفاق رائے نہ ہوسکی۔

ٹوکیو جاپان میں منعقد ہونے والی حالیہ منی وزارتی اجلاس جو کہ ۱۴۔۱۶ فروری ۲۰۰۳ کو ہوئی، جس میں دنیا کے ۲۲ ممالک کے وزرائے تجارت نے شرکت کی، ناکامی کا شکار ہوئی۔کانفرنس میں حالیہ زرعی مسودہ پر کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچا جاسکا۔

عراق پر ممکنہ امریکی حملہ اور جنگ کے حوالے سے یورپ اور امریکہ کے درمیان اختلافات، اجلاس پر حاوی رہے۔ اجلاس سے قبل ڈبلیو ٹی او کے ڈائریکٹر

جنرل نے کہا ''ہمیں اس وقت ایک ناگزیر مشکل کا سامنا ہے۔ جس سے صرف سخت قسم کی خصوصی توجہ طلب سیاسی توانائی کے ذریعے ہی بچا جا سکتا ہے''۔

''ہارنسن مسودہ'' کے حوالے سے تیسری دنیا کے طرف سے بھرپور اعتراضات سامنے آئے ہیں۔ پاکستان نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ تجویز کردہ اصلاحات ہماری ضروریات کی یکسر نفی کرتا ہے۔ حکومت پاکستان نے تجویز کیا ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں کو کسی ملک میں مقامی کمپنی کی طرح سہولیات دینے کی تجویز ختم کی جائے کیونکہ اس سے مقامی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مزید یہ کہ پاکستان، غریب ملکوں کو براہ راست غذائی امداد فراہم کرنے کے بھی خلاف ہے اور تجویز کیا ہے کہ امداد کا عمل ایک باقاعدہ پالیسی کے تحت ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ترقی یافتہ ممالک وسائل کے اجتماعی ذخیرہ (ریسورس پول) کو تشکیل دیں تاکہ کسی بے قاعدگی سے بچا جا سکے۔

پاکستان نے بلیو بکس کو ترقی پزیر ممالک کے لیے غیر منصفانہ قرار دیا ہے۔ برآمدی مراعات کے حوالے سے دستاویز پر تنقید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس سے ترقی یافتہ ممالک کو مزید سہولت مل جائے گی اس طرح ترقی یافتہ ممالک اپنے ملکوں میں ترقی پزیر ملکوں کی زرعی درآمدات سے اپنے زراعت کے شعبے کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جب کہ ترقی پزیر ممالک کی عالمی منڈی تک رسائی مشکل ہی رہے گی۔

پاکستان نے محصولات پر ہر طرح کے کوٹہ کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ محصولات میں کوٹہ، منڈی کے اصول وضوابط کی نفی کرتا ہے۔[۳]

حکومتوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبہ سے تعلق رکھنے والے ادارے اور افراد بھی حالیہ زرعی تجاویز پر کڑی تنقید کر رہے ہیں۔

پائیدار زرعی عملی گروپ (ساگ) کے زیر اہتمام پاکستان بھر سے تقریباً ۶۰۰ کسانوں نے بھی حالیہ پیش کردہ زرعی مسودے کے مخالفت میں احتجاجی مارچ کیا۔ مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ ہمیں بڑی غیر ملکی کمپنیوں کے مقابلے میں تحفظ فراہم کیا جائے جو کہ پاکستانی زرعی معیشت کو تباہ کر رہی ہیں۔

مظاہرین نے بینر اور پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر ''ہم زرعی معاہدے کے حوالے سے حالیہ ہارنسن مسودہ کو نہیں مانتے''، ''زراعت کو ڈبلیو ٹی او دائرہ اختیار سے باہر کرو'' جیسے مطالبے درج تھے۔ اس موقع پر اتحاد زمینداران وکاشتکاران کے صدر جان نثار خلیل نے کہا کہ ''ہم ڈبلیو ٹی او کے کسان دشمن فیصلے کو مسترد کرتے ہیں''۔[۴]

زراعت کے حوالے سے تجویز کردہ نئے پہلوؤں پر عالمی سطح پر بھی تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ ممتاز عالمی تجارتی ماہر بگرت لال داس نے اس مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''موجودہ مسودہ ترقی پزیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان حائل ناہمواریوں کو دور کرنے میں بری طرح ناکام ہے کیونکہ ترقی پزیر ممالک کی تجاویز، شکایات اور خدشات سرے سے نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے حالیہ پیش کردہ زرعی مسودہ ترقی پزیر ممالک کے لیے مزید اہمیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ آئندہ ہونے والے تمام زرعی مذاکرات اسی دستاویز کو بنیاد بنا کر کیے جائیں گے اور اسی دستاویز کی بنیاد پر پانچویں وزارتی اجلاس میں بات چیت ہوگی''۔ مسٹر لال داس نے زور دے کر کہا کہ ''ترقی پزیر ممالک حالیہ پیش کردہ مسودہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لیے ایک متوازی دستاویز مرتب کریں جس میں زراعت کے حوالے سے درپیش تمام خدشات، مشکلات اور شکایات کو مدنظر رکھا جائے۔ تاکہ عالمی مذاکراتی دور میں ترقی پزیر ممالک کے موقف کو بھی سامنے لایا جا سکے۔''[۵]

ایسا لگتا ہے کہ چیئرمین زرعی کمیٹی کی موجودہ اصلاحات اس امر کو یقینی بنانے کے لیے تجویز کی گئی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو منڈی سے دور رکھا جائے اور عالمی منڈی میں اجارہ داری صرف اور صرف پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی دیوہیکل کمپنیوں کی رہے۔

عالمی سطح پر ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں پر اس کے رکن ممالک کے علاوہ عوامی، سماجی اور سیاسی تنظیمیں بھی شدید تنقید کر رہی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ موجودہ اینٹی گلوبلائزیشن تحریک کا آغاز ڈبلیو ٹی او کے سیاٹل اجلاس کے خلاف عوامی مزاحمت سے شروع ہوئی تھی۔ عالمگیریت کے خلاف بین الاقوامی عوامی گٹھ جوڑ کا ایک سالانہ اجتماع ہر سال برازیل میں ورلڈ سوشل فورم کے تحت ہوتا ہے۔ گزشتہ فورم میں ایک لاکھ سے زائد افراد شریک ہوئے۔ جن میں اصلاح پسند اور انقلابی موقف رکھنے والے ادارے اور افراد شامل ہیں۔ ورلڈ فورم ایک اوپن فورم کے طور پر کام کرتا ہے جہاں آزاد معیشت کے حق ومخالفت دونوں میں بولا جاتا ہے۔ بظاہر اس فورم کو انقلاب کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے مگر فورم کے انعقاد کا مالی تعاون بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں کرتی ہیں جس سے اس کے اثرات اور انقلابی ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے! جس طرح سرمایہ دارانہ نظام اپنے آپ کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے انسانی آزادی، شراکت داری اور باہمی شمولیت وغیرہ جیسے ہتھیار کو اپنے پالیسیوں کے فروغ کے لیے استعمال کرتا ہے اور نتیجتاً عوامی شعور میں اضافہ، مزاحمت کی سوچ، طبقاطی فرق، ظلم وجبر جیسے بنیادی آگہی عام ہونے میں مدد ملتی ہے، بالکل اسی طرح ورلڈ شوسل فورم بھی انقلابی سوچ رکھنے والوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور اصلاح پسند فکر کے رد اور طبقاتی نظام سے نبرد آزما ہونے کے لیے تبادلہ خیال اور حکمت عملیاں طے کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

گزشتہ ورلڈ سوشل فورم میں زراعت کو آزاد معیشت کا حصہ بنانے پر تقریباً ہر پلیٹ فارم پر تنقید کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ غریب ممالک کے لیے زرعی پالیسیوں میں نرمی کی جائے۔ بعض مواقعوں پر یہ بھی مطالبہ کیا گیا عالمی تجارت کی بنیاد آزاد تجارت کے اندھا دھند فروغ کے بجائے، برابری اور انصاف کی اصولوں کو مدنظر رکھ کر وضع کی جائے۔

ڈبلیو ٹی او میں زرعی معاہدے کے منفی اثرات پر ویا کمپا سینا اور فرنڈز آف دی ارتھ کا بڑا واضح موقف سامنے آیا کہ موجودہ زرعی پالیسیاں جس میں محصولات میں کٹوتی، برآمدی مراعات، جینیاتی انجینئرنگ اور ذہنی ملکیت وغیرہ کو فروغ دینے کی پالیسیوں پر شدید تنقید کی گئی کیونکہ اس سے تیسری دنیا کی زرعی معیشت کی تباہی، مزدور کسان کی روزمرہ زندگی اور تحفظ خوراک کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

ورلڈ سوشل فورم میں ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں خاص کر زرعی پالیسیوں پر تنقید

کی گئی اور پانچویں وزارتی کانفرنس کے حوالے سے مختلف پلیٹ فارم کی جانب سے مختلف تجاویز بھی دی گئیں مگر زرعی کمیٹی کے چیئرمین کے حالیہ مسودہ سے ایسا لگتا ہے کہ ورلڈ سوشل فورم میں لاکھوں افراد کی جانب سے کیے گئے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دنیا کے لیے بنائی جانے والی پالیسیوں پر ان لاکھوں افراد کے جذبات اور مطالبات کو مدنظر نہ رکھنے سے ورلڈ سوشل فورم کی افادیت اور اس کا انعقاد بے مقصد ہو جاتا ہے۔

موجودہ زرعی بحث کے حوالے سے ایشیاء و بحرالکاہل کے ممالک فلپائن، جاپان، کوریا، تھائی لینڈ، انڈیا، نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان، ملیشیا اور انڈونیشیا کی کچھ تنظیموں نے مل کر ''مہم برائے خوراک کی حق خودارادیت'' کا آغاز کیا ہے۔ پاکستانی تنظیم روٹس فار ایکوٹی بھی اس مہم میں حصہ لے رہی ہے۔ مہم کا بنیادی مقصد دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ تیسری دنیا کے زیادہ تر کسان چھوٹے پیمانے پر صرف اپنے گھریلو ضروریات کے لیے غذائی فصلیں کاشت کرتے ہیں جو کہ بین الاقوامی تجارتی پالیسیوں کے زیر اثر نہیں آتے۔ اس طرح زرعی معاہدہ اور اس میں موجود ہارنسن کا نیا تجویز کردہ زرعی مسودہ چاہے مساویانہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہی کیوں نہ مرتب کر دیا جائے، بہرحال تیسری دنیا کے زیادہ تر کسان اور خاص کر پاکستان کے ۹۳ فیصد کسانوں کے مفاد میں نہیں ہو سکتا۔

خوراک کی خودارادیت کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ دنیا کے کسانوں کو اپنی سماجی، ثقافتی اور معاشی ضروریات کی روشنی میں اپنی مرضی سے پیداواری نظام تشکیل دینے کی آزادی ہو۔ جیسا کہ کئی صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے اور صرف یہی ایک طریقہ دنیا بھر کے غریب مزدور کسان کے تحفظ خوراک کو یقینی بنا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر دنیا بھر کے مزدور کسان ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر کرو'' کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔

اب تیسری دنیا کی حکومتوں اور عوام کو یہ طے کرنا ہے کہ زراعت کے حوالے سے اپنی تباہی کے بنیادی اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے یا اصلاح پسندوں کی حکمت عملیوں پر عمل کرتے ہوئے رائج سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے سطحی تبدیلیوں کے ذریعہ اپنے لیے تاحیات کسمپرسی کی زندگی کا انتخاب کرنا ہے۔ کیونکہ حکمرانوں کے مفادات عوامی مفادات سے ہمیشہ متصادم ہوتے ہیں اس لیے امید کی واحد کرن دنیا بھر کے مزدور کسان اور عوام کی سرمایہ دارانہ عالمگیریت کے خلاف بھرپور مزاحمت ہے۔

حوالہ جات: ۱۔ نیگوسی ایشنز آف ایگریکلچرل، فرسٹ ڈرافٹ آف موڈالیٹیز فار دی فردر کمیٹ مینٹس، ایڈوکیسی کاپی، ۱۷، فروری ۲۰۰۳، صفحہ ۲۔ ۲۔ ایگریمینٹ آن ایگریکلچرل (اے او اے)، اے سیریز آن دی ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، روٹس فار ایکوٹی۔ ۳، ۴۔ ڈان، ۲۶، مارچ ۲۰۰۳۔ ۵۔ www.twnside.org.sg/title/twninfo5.htm

اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ کے عوام اور ماحولیات پر اثرات کا تجزیہ

انڈیا کے صوبہ کیرالہ کے ایک ضلع کا سارا گوڈ میں تحقیق سے سامنے آنے والے انکشافات

چیلنج رپورٹ

انڈیا کے صوبے کیرالہ کے ضلع ''کاسارا گوڈ'' میں کاجو کاشت کی جاتی ہے۔ یہ فصل پلانٹیشن کارپوریشن آف کیرالہ (پی سی کے) کی ملکیت ہے۔ پی سی کے کاجو کی فصل پر اینڈوسلفان نامی کیڑے مار دوا کا ہوائی چھڑکاؤ کرتی تھی۔ اس چھڑکاؤ کی بدولت آج ۱۵ پنچائتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ان مخصوص انہونی بیماریوں کی شکایت کرتے ہیں جن سے وہ اب تک نا آشنا تھے۔

اینڈوسلفان نامی خطرناک کیڑے مار دوا کا چھڑکاؤ ۲۶ سال تک ہوتا رہا تاوقتیکہ اس پر پابندی نہ لگا دی گئی۔ پابندی سے قبل، کاجو کی فصل پر سال میں تین دفعہ اینڈوسلفان کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔

مقامی کسانوں اور ذرائع ابلاغ نے ۱۹۷۹ سے ہی اینڈوسلفان کے اثرات کے بارے میں شکوک وشبہات ظاہر کیے تھے۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط میں شہد کی مکھیاں، مچھلی، مینڈک اور پرندوں کی اینڈوسلفان کے چھڑکاؤ کے باعث بڑے پیمانے پر ہلاکت سے بھی آنے والے خطرات کی نشاندہی ہوئی تھی۔ گائے اور چوزے اکثر بیمار رہنے لگے۔ ۱۹۷۹ میں ایک مقامی کسان، کیڑے مار ادویات اور گائے کے بچھڑے کی ٹانگوں میں پیدائشی خرابی کے واضح تعلق کی نشاندہی کرنے والے پہلے شخص تھے۔ اس کے بعد ۱۹۸۱ میں ایک مقامی صحافی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس نے ایک مضمون ''زندگی کی قیمت کاجو سے بھی کم'' میں شک ظاہر کیا کہ اس کے گاؤں کے علاقے میں کاجو کی پلانٹیشن (باغات) پر اینڈوسلفان کی ہوائی چھڑکاؤ سے ماحولیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ میں شواہد کے بڑھتے ہوئے اثرات کے دباؤ میں آ کر مقامی عدالت نے کچھ عرصے کے لیے کیڑے مار دوا کے ہوائی چھڑکاؤ پر پابندی عائد کی۔ لیکن ۱۹۸۸ میں پی سی کے نے قومی تحقیقی مرکز برائے کاجو (این آر سی سی) سے اپنی فصل کو مخصوص مچھر نما کیڑے سے بچاؤ کی خاطر تجاویز طلب کیں۔ اس طرح قومی تحقیق مرکز برائے کاجو نے ۱۹۹۷ میں پہلی مرتبہ اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ کے مقدار کو ۰٫۵ فیصد متعین کیا۔

لیکن یہ حقیقت اب جا کر واضح ہوئی ہے کہ قومی تحقیقی مرکز کی تجاویز پر سرے سے عمل ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ اس قدر کم مقدار میں اینڈوسلفان کے استعمال سے کیڑوں پر قابو پانا مشکل تھا۔ اس لیے اسے غیر موثر خیال کیا گیا تھا۔ این آر سی سی کے مطابق علاقے میں بیماریوں کی وجہ وہاں کے پانی میں آلودگی تھی۔

اس دوران ایک مقامی ڈاکٹر نے نئے حیران کن امراض کی بڑھتی ہوئی تعداد کو انتہائی سنجیدگی سے لیا اور اس حوالے سے کئی طبی ایسوسی ایشن اور دیگر ذہنی امراض کے ماہرین کو کاسارا گوڈ میں رونما ہونے والی عجیب وغریب بیماریوں کے بارے میں لکھا۔

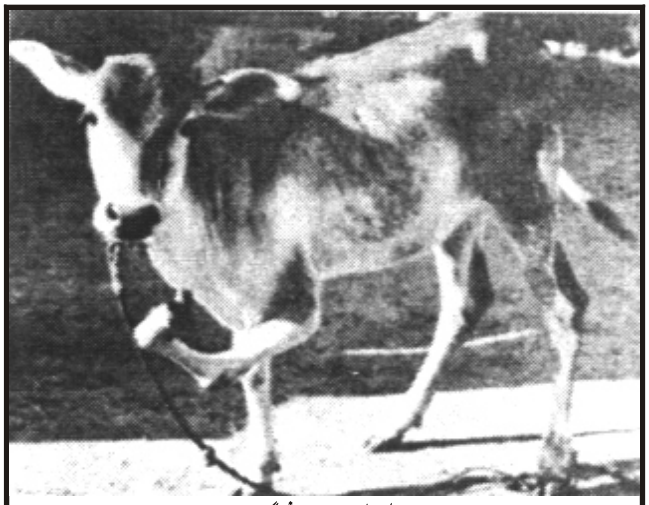
اینڈوسلفان سے متاثرہ گائے

کاسارا گوڈ کے ضلع میں اینڈوسلفان کا ہوائی جہاز کے ذریعے چھڑکاؤ شروع ہوا تو اس علاقے کے بچوں میں پیدائشی ذہنی معذوری کے علاوہ جسمانی معذوری دیکھنے میں آئی۔ بچوں میں معمول سے ہٹ کر ذہنی نشوونما ہونے کی وجہ سے ذہن کے متاثر ہونے والی بیماری پائی گئی جو پیدائش کے وقت یا اس سے قبل بچوں کو لاحق ہوتی ہے۔ ایک دوسری بیماری سے اعصابی نظام میں خلل پیدا ہوتا ہے جس سے پورا اعصابی نظام کمزور ہو کر صحیح طور پر کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بچے اچانک ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اینڈوسلفان کے چھڑکاؤ کے باعث بچوں کے سر میں مائع جمع ہونے کی وجہ سے ان کے سر کی جسامت معمول سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، جس سے دماغ کے افعال متاثر ہوتے ہیں۔

ان خطرناک امراض کے علاوہ نفسیاتی مسئلوں میں بھی اضافہ ہوا، جس کی وجہ سے خودکشی کے رجحانات بڑھے ہیں۔ ڈاکٹروں نے کینسر کے بڑھتے ہوئے واقعات کی بھی اطلاع دی ہے۔ جس میں جگر اور خون کا کینسر قابل ذکر ہیں۔ چھاتی اور گلے کے کینسر کے علاوہ پیدائشی نظام کی کئی بیماریوں کی شرح میں بھی اضافہ ہوا۔ مردوں میں کینسر کی شرح عورتوں سے دگنی ہے۔ جبکہ قبل از وقت بچوں کی پیدائش کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ جوڑوں کا درد اور فالج عام ہیں۔ سانس اور مستقل بنیادوں پر بیماریاں بچوں کے ممکنہ مدافعاتی نظام کے متاثر ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مسئلہ

دوسرے علاقے سے یہاں آباد ہونے والی ایک عورت نے اپنے بچے کی قوت گویائی کے متاثر ہونے اور ذہنی دباؤ میں مبتلا ہونے کے پیش نظر متعلقہ ادارے اور حکام سے درخواست کی کہ اس کی آبادی میں کھیتوں پر اینڈوسلفان کا چھڑکاؤ بند کیا جائے۔ کیرالہ اسٹیٹ پولوشن کنٹرول بورڈ (کے ایس پی سی بی) نے علاقے کے کنویں سے حاصل کردہ پانی کے معائنہ کے بعد انکشاف کیا کہ پانی کیمیائی آلودگی سے پاک ہے۔ کچھ عرصے بعد ادارے کے تجزیہ کے طریقہ کار پر شدید تنقید ہوئی، جس کا اعتراف ادارے کے چیئرمین نے بھی کیا۔

۱۹۹۸ میں ایک مقامی کسان سیاستدان نے اس مسئلہ کو مقامی عدالت میں اٹھایا۔ بہت ساری مقامی تنظیمیں بھی اس جنگ میں شریک ہوئیں۔ حقائق کی چھان بین سے پتہ چلا کہ پلانٹیشن کارپوریشن آف کیرالہ (پی سی کے) ۱۹۶۸ کے کیڑے مار ادویات کے قانونی ضابطوں کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ بہت سارے مقامات پر پی سی کے کے اہلکاروں نے اپنا نام نہ ظاہر کرنے کی درخواست کرتے ہوئے اینڈوسلفان کے استعمال کی وجہ سے صحت کے مسائل کے جنم لینے کا اعتراف کیا ہے۔

جنوری ۲۰۰۰ میں ایک تحقیق کے دوران اسکول کے بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اسکول کے عقبی راستے سے آنے والے بچوں میں ذہنی اور جسمانی پسماندگی کی وجہ سے وہ اسباق صحیح طرح سے پڑھنے، سیکھنے میں کمزوری کا شکار تھے۔ یہ راستے ان کھیتوں سے گزرتے تھے جن پر اینڈوسلفان کا ہوائی چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ ۱۵۲ بچوں میں سے ۴۰ بچے ان راستوں سے اسکول آتے تھے۔ ان میں معمول سے ہٹ کر پیدائشی اور جسمانی نقائص پائے گئے۔ دراصل اسکول کا جو کے باغات کے پیچھے واقع تھا۔

اکتوبر ۲۰۰۰ میں ایک مقامی عدالت نے کیڑے مار ادویات کے ہوائی چھڑکاؤ پر پابندی عائد کی۔ مقامی پنچائت کی ایماء پر فیصلہ کیا گیا کہ اینڈوسلفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک تنظیم تشکیل دی جائے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اینڈوسلفان کے بارے میں ضلعی سطح پر معلومات بہت کم ہیں، قومی اور بین الاقوامی ذرائع سے معلومات اکھٹی کی گئیں جنہوں نے ان کے خدشات کی تصدیق کی۔

اینڈوسلفان کے بارے میں عوامی شک وشبہات یقین میں تبدیل ہو گئے کہ وہ ایک خطرناک کیمیائی کیڑے مار دوا کا سامنا کر رہے ہیں، جو مرکزی اعصابی نظام، پیدائشی نظام، مدافعاتی نظام، جگر، گردے اور جلد کو متاثر کرتا ہے۔ اس سارے ظلم کے دوران حکومتی مشینری اور قوانین، کیڑے مار ادویات کے زہر سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ کیرالہ زرعی یونیورسٹی کے تحقیقی ٹیم کے خیال میں اینڈوسلفان ایک محفوظ کیڑے مار دوا تھی۔ مقامی یونیورسٹی اور تنظیموں کے اینڈوسلفان کے استعمال پر اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے بالآخر سائنس اور ماحولیات مرکز نے نئی دہلی سے محققین کی ایک ٹیم بھیجی، جس نے ۲۵ مختلف نمونوں کا تجزیہ کیا۔ تحقیقی نتائج سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ ان نمونوں میں اینڈوسلفان کی مقدار خطرناک حد تک موجود ہے۔ اس ادارے نے اپنی تحقیقی رپورٹ ۲۰۰۱ میں جاری کی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۲۶ سال کے

دوران پی سی کے نے کبھی بھی اپنے مزدوروں کا طبی معائنہ نہیں کروایا تھا۔

شواہد کی تصدیق کے بعد عدالتوں میں کئی مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ ۲۰۰۱ میں مقامی عدالت نے کاسارا گوڈ میں ہر قسم کی کیڑے مار ادویات کے استعمال پر پابندی عائد کی۔

کیرالہ حکومت نے ریاست کے حدود میں ہر قسم کی فصل پر اینڈوسلفان کے استعمال پر پابندی لگا کر رکھی ہے۔ اسی طرح کا قدم اٹھاتے ہوئے کرناٹک کی حکومت نے بھی کاجو کی فصل پر اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ پر پابندی عائد کی۔

صحت پر شدید اثرات

درج ذیل میں وہ شدید اثرات دیے گئے ہیں جو اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ کے بعد سامنے آئے ہیں۔

- چھڑکاؤ سے ناگوار بو ہوا میں پھیل جاتی ہے اور لوگوں کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔
- پورا علاقہ چھڑکاؤ کی وجہ سے دھندلا دکھائی دیتا ہے۔
- آنکھوں میں جلن اور خارش محسوس ہوتی ہے جبکہ بعض اوقات آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ - سر درد اور چکر۔ - دم گھٹنے اور گلہ بند ہونے کا احساس۔
- جلدی خارش جبکہ رگڑنے پر سوج جانا۔
- چرنے والے جانوروں پر مرگی کے دورے جو بعض اوقات موت کا باعث بنتے ہیں۔ خون بہنے کے نتیجے میں حمل کا ضائع ہونا اور بعض اوقات گائے اور کتیا (اگر حاملہ ہوں) کا مر جانا۔

صحت کے عام مسائل

- کمزور ہونے کی وجہ سے لوگوں میں جلدی تھکنے کا رجحان عام پایا گیا۔

بہت سارے ایسے مزدور جو جسمانی نوعیت کے کاموں میں ملوث ہیں، انہوں نے شکایت کی کہ وہ پہلے کی طرح کام نہیں کر سکتے۔ پہلے وہ ۸ گھنٹہ سے زیادہ کام کرتے تھے لیکن اب وہ ۲ یا ۳ گھنٹہ ہی کام کر سکتے ہیں۔ - عورتوں اور بچوں سمیت بہت سارے لوگوں میں بخار جیسے امراض مدافعاتی نظام پر منفی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔

- لوگ، خاص کر عورتیں اپنی عمر سے زیادہ کی دکھائی دیتی ہیں۔
- ایسے نوجوان مرد جن کو جسمانی لحاظ سے مزید نشوونما کرنی ہے وہ بھی اپنی عمر سے زیادہ کے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۰ سال کے عمر کے نوجوان ۲۵ تا ۳۰ سال کی عمر کے آدمی نظر آتے ہیں۔
- لوگوں نے بانجھ پن کے کئی واقعات کے بارے میں انکشاف کیا۔ بانجھ پن مردوں میں زیادہ ہے۔ مقامی ڈاکٹروں نے بانجھ پن عام ہونے کی تصدیق کی۔

تحقیق میں عورتوں کی مختلف مخصوص زنانہ امراض کا ذکر کیا گیا ہے۔

جلد کو متاثر کرنے والے مسائل

- بہت سارے لوگوں کو بار بار چھوٹے خارشی پھوڑوں سے لے کر معیادی سرخ دانوں والی چنبل اور داد جیسی بیماری لاحق ہوئی۔
- ہتھیلیوں اور ہاتھوں پر سرخ داغ اور دھبے نظر آئے ہیں جس میں خارش ہوتی ہے۔
- ہاتھوں اور پاؤں میں سوجن اور جلد کا سیاہ ہونا بھی پایا گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے سوجنے کی شکایت ان مزدوروں کی طرف سے آئی ہے جو کیڑے مار ادویات کو ملانے اور چھڑکاؤ جیسے کام سے تعلق رکھتے تھے۔
- مندرجہ بالا کام سے تعلق رکھنے والے ایک سابقہ ملازم نے بتایا کہ ہر مزدور کو کسی نہ کسی قسم کی جلدی بیماری لاحق ہے۔ اس مزدور کی بیٹی نے اپنے کئی زنانہ امراض گنوائے۔
- عورتوں نے اپنے پورے جسم کے اکثر سوجنے یا پھولنے کی شکایت بھی کی۔

اینڈوسلفان کے زہر سے بچوں کے سر معمول سے بڑھ جاتے ہیں

کینسر

کئی علاقوں میں سروے کے بعد معلوم ہوا کہ لوگ منہ، گلے اور پیٹ کے کینسر جیسے موذی امراض میں مبتلا تھے۔ عورتیں چھاتی کے امراض میں زیادہ مبتلا پائی گئیں۔

ایک ڈاکٹر نے ۱۲۶ گھرانوں میں سے ۱۵۱ افراد کے کینسر سے ہلاک ہونے اور ان ہی گھرانوں میں مزید ۴۱ افراد کے کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بارے میں بتایا۔ ایک دوسری تحقیق کے مطابق ۵۲ خاندانوں میں گزشتہ پانچ سال کے عرصہ میں ۱۱ افراد کینسر سے ہلاک ہوئے۔

اموات کے قریبی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ سال بہ سال کینسر سے مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۸۲-۱۹۸۷ کے دوران ۳۷ افراد، ۱۹۸۸-۹۳ کے دوران ۴۹ اور ۱۹۹۴-۹۹ میں بڑھ کر ۷۱ افراد کینسر کا شکار ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۶ سال کے عرصہ میں کینسر سے مرنے والوں کی تعداد میں ۳۳ فیصد اور ۱۲ سال کے عرصہ میں ۹۲ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

اس کے برعکس ایک ایسے علاقے میں جو اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ سے محفوظ رہا وہاں ۸۷-۱۹۸۲ میں ۴۰، ۹۳-۱۹۸۸ میں ۳۲ اور ۹۹-۱۹۹۴ کے دوران ۱۴۷ افراد کینسر سے ہلاک ہوئے۔

- بڑی تعداد میں لوگ گلے کے کینسر میں مبتلا ہیں۔

- کئی ایسے لوگ موجود تھے جن کی قوت گویائی کی صلاحیت دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی۔ آواز ختم ہونے کے ساتھ ساتھ جب گلے میں درد ہونا شروع ہوتا ہے، تشخیص کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ گلے کا کینسر ہے۔ بہت سارے مردوں نے گلے میں تکلیف کی شکایت کی۔

بصارت سے وابستہ مسائل

- اینڈوسلفان کے ہوائی چھڑکاؤ کے دوران لوگوں کی آنکھوں میں خارش اور آنکھوں کی دیگر بیماریاں ہوتی تھی۔ بعض اوقات آنکھوں میں کھجلی چھڑکاؤ کے تین دن بعد بھی جاری رہتا تھا- بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو نظر سے متعلق مسائل کا سامنا تھا لیکن اس کو دوا کے چھڑکاؤ سے براہ راست نہیں جوڑا گیا تھا اور لوگ نہیں جانتے تھے کہ اس کی وجہ اینڈوسلفان ہے۔ اب جا کر معلوم ہوا ہے کہ آرگانوکلورینز (کیمیکل گروپ جس سے اینڈوسلفان کا تعلق ہے) سے طویل عرصے تک تعلق رہنے کے باعث سماعت و بصارت پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

- پلانٹیشن کارپوریشن آف کیرالہ (پی سی کے) کے چند اہلکاروں نے اپنے نام چھپائے جانے کی یقین دہانی کے بعد بتایا کہ تقریباً ہر مزدور آنکھوں میں کھجلی، جلن، دائمی دردسر کے ساتھ بعض اوقات بصارت سے محرومی جیسے امراض کے شکار ہیں۔

پیٹ سے متعلق امراض

- اچھی خاصی تعداد میں لوگ، جن میں مرد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اکثر پیٹ کے درد میں مبتلا ہوتے تھے۔ بعض اوقات درد کے ساتھ قے کی شکایات بھی بتائی گئی۔ یہ مسئلہ بچوں میں زیادہ عام ہے۔

- ایک اسکول کی نرس نے بچوں کے ایک جائزے کی بنیاد پر بتایا کہ اس کے اسکول کے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیٹ میں درد جیسے مسائل کے شکار تھے۔

پیدائشی نظام سے وابستہ امراض

کاجو کی فصل کی کاشت کے قریبی علاقوں اور ان خاندانوں کے افراد، جو چھڑکاؤ میں حصہ لیتے رہے ہیں، سے پوچھ گچھ کے بعد پتہ چلا کہ لگ بھگ تمام ہی عورتوں کو زنانہ امراض لاحق تھے۔ ان میں عورتوں کے مخصوص ایام کے مسائل خاص کر اہم ہیں۔ اس کے علاوہ درد، سردرد، سر چکرانا اور جسم کی کمزوری وغیرہ بھی بہت ساری عورتوں کو لاحق بیماریوں میں شامل ہیں۔ ۳۰ سال کی عمر کی عورتیں اپنی عمر سے کہیں زیادہ کی نظر آتی ہیں۔ ان عورتوں میں جلدی تھکن اور کمزوری عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عورتیں وہ کام کرنے سے بھی قاصر جو ان کی ہم عمر عورتیں عموماً کرتی نظر آتی ہیں۔

اینڈوسلفان سے بچوں کے اندر پائے جانے والے جسمانی نقائص کا ایک نمونہ

مرکزی اعصابی نظام سے متعلق مسائل

کئی جائزوں سے واضح ہوتا ہے کہ اینڈوسلفان سے لوگوں کا اعصابی نظام متاثر ہوا ہے۔ بچوں میں پیدائشی ذہنی اور جسمانی امراض کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ نفسیاتی مسائل بھی اس زمرے میں شامل ہیں کیونکہ جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ نفسیاتی مسائل صرف دماغی صحت سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس کا تعلق اعصابی نظام سے بھی ہوتا ہے۔ یہ شواہد موجود ہیں کہ خود کشی اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ اعصابی زہر آلودگی (Neurotoxins) ہوتی ہے۔

ایک ڈاکٹر کے صرف ۱۲۶ گھرانوں کے سروے سے انکشاف ہوتا ہے کہ اینڈوسلفان کے متاثر ہونے کی وجہ سے ۳۸ افراد ذہنی پسماندگی، ۴۹ نفسیاتی الجھنوں اور ۳۳ افراد مرگی کے شکار ہوئے جبکہ ۱۱ افراد پہلے ہی خودکشی کر چکے تھے۔ اسی طرح کے واقعات کی اطلاع دیگر دیہاتوں سے بھی ہے۔ بچوں کے سر میں مائعات جمع ہونے کی وجہ سے سر بڑھنے کے عمل سے بیماری کے شکار بچوں اور فالج سے مرنے کی تعداد میں گزشتہ ۱۲ سال کے دوران پانچ گنا یا ۴۸۸ فیصد بڑھی ہے۔ اس کا اعصابی نظام کی کمزوری سے گہرا تعلق ہے۔

ایک تحقیقی مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے کے مرنے کے امکانات اس صورت میں زیادہ ہوتے ہیں جب وہ عورت کیڑے مار دوا کے چھڑکاؤ کے ۹ کلومیٹر رقبہ کے حدود کے اندر رہتی ہے۔

ان تمام شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اینڈوسلفان انسانی صحت اور ماحول کے لیے انتہائی خطرناک دوا ہے۔

(یہ تحریر تھنل کنزرویشن ایکشن اینڈ اینفارمیشن نیٹ ورک کیرالام (کیرالہ) بھارت کے شائع کردہ ایک تحقیقی رپورٹ کے چند حصوں کے ترجمے پر مبنی ہے)

مزدور کسان عورت: ایک آپ بیتی

صفیہ جلیل

اماں لکشمی ایک مزدور کسان ہیں جو سارا سال کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ ان کے خاندان میں نہ صرف وہ خود مزدوری کرتی ہیں بلکہ ان کے شوہر اور بیٹے بھی یہی کام کرتے ہیں۔ ہم یہاں پر ان کی زندگی کے گزشتہ تین ماہ کی تفصیل پیش کر رہے ہیں، تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ پاکستان میں مزدور کسان مرد یا عورت انتہائی کٹھن محنت کے بعد بھی کیا حاصل کر پاتے ہیں۔

اماں لکشمی کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ مزدوری اپنے گاؤں کے آس پاس ہی مل جائے بلکہ معاش کی تلاش میں دور تک بھی جانا پڑتا ہے۔ اس سال کپاس کی چنائی کے لیے وہ اور ان کا ایک بیٹا اپنے گوٹھ (گاؤں) سے تقریباً ۶۰ کلو میٹر دور ہالہ، ضلع شہداد پور گئے۔ دونوں ماں بیٹے وہاں جا کر تقریباً ڈیڑھ ماہ ایک گوٹھ میں رہے۔ اماں لکشمی کھانا پکانے کا سامان ساتھ لے کر گئی تھیں اور مزدوری کے ساتھ ساتھ رہنے اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتی تھی۔ ان کا بیٹا صبح ۷ بجے کھیتوں پر کپاس چننے چلا جاتا تھا جبکہ وہ خود کھانا پکانے کے بعد روٹی ساتھ لیکر متعلقہ کھیت پر صبح ۹ بجے تک پہنچ جاتی تھیں۔ اماں لکشمی بتاتی ہیں کہ کپاس چننے کے دوران ہاتھوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔ کپاس کے پودے میں لگے ہوئے کانٹے انگلیوں کے پوروں کو زخمی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے بچوں کی فکر لاحق رہتی تھی جن کو وہ اپنے گوٹھ میں شوہر کے پاس چھوڑ کر آئی تھیں۔ ان سے گفتگو کے دوران یہ محسوس ہوا کہ ان کے لیے اپنے بچوں کو چھوڑ کر آنا اتنا ہی کٹھن تھا جتنا کہ کپاس کی چنائی۔

ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں دونوں ماں بیٹے نے مل کر ۲۰ من (۸۰۰ کلوگرام) کپاس کی چنائی کے عوض ۲,۰۰۰ روپے اجرت وصول کیے، یعنی فی من ۱۰۰ روپے مزدوری دی گئی۔ اپنے گوٹھ سے ہالہ اور واپسی کا خرچہ ہی ۴۰۰ روپے تھا۔ اس کے علاوہ وہاں ڈیڑھ ماہ رہنے اور کھانے پینے کا خرچہ ۵۰۰ روپے ہوا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اماں لکشمی نے انتھک محنت کے بعد پورے ایک ماہ میں کل ۶۶۰ روپے بطور اجرت حاصل کیے اور اگر کھانے پینے اور سفر کا خرچہ نکال دیا جائے تو باقی کچھ بھی نہیں بچے گا۔

ہالہ سے واپس آ کر اماں لکشمی ماتلی کے ایک گوٹھ میں چاول کی کٹائی کا کام کرنے چلی گئیں جہاں انہوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ یہاں پر سفر کے اخراجات ۱۰۰ روپے آئے۔ ان کے خیال میں یہ دو ہفتے سخت محنت اور تکلیف والے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چاول کا پودا پانی میں کھڑا ہوتا ہے اور ہمیں پانی میں اتر کر فصل کاٹنی پڑتی ہے، پانی کے اندر گڑھے بھی ہوتے ہیں۔ چاول کے کھیت میں مسلسل کھڑے ہو کر فصل کاٹنے کے تکلیف دہ منظر کو یاد کرتے ہوئے کہا ''کیچڑ اور پانی میں اتر کر فصل کاٹنی پڑتی ہے جس سے گھٹنوں میں درد ہوتا ہے''۔ اس کے علاوہ پانی میں کام کرتے ہوئے سخت ڈر بھی لگتا ہے کیونکہ ''پانی میں بلائیں بھی ہوتی ہیں''۔ اماں لکشمی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پانی میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں جو کاٹتے ہیں اور پھر پیر بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ ان دو ہفتوں کی محنت کی اجرت دو من چاول کی صورت میں ادا کی گئی تھی۔ اگر ہم ایک من چاول کی قیمت کا تعین کریں تو یہ ۴۰۰ روپے بنتے ہیں اس طرح اماں لکشمی کو ۸۰۰ روپے مالیت کے برابر چاول دیے گئے۔ اگرچہ چاول کی کٹائی اور صفائی کی اجرت کپاس کی چنائی سے کہیں زیادہ ہے لیکن اس کام میں محنت بھی کئی گنا بڑھ کر ہوتی ہے۔ کھیت سے فصل کاٹنے کے بعد اسے سکھایا جاتا ہے۔ سوکھنے کے بعد جانوروں کی مدد سے فصل میں سے چاول اور بھوسہ الگ الگ کیا جاتا ہے۔ صبح سویرے سے لیکر شام گئے تک محنت کرنی پڑتی ہے لیکن مزدور کسان اس کام کو بڑی دل جمعی سے کرتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کو کھانے کے لیے اناج مل جاتا ہے۔ اس بات کی تصدیق اماں لکشمی کی زندگی کے تین ماہ کے جائزے سے بھی ہوتا ہے۔

اماں لکشمی کپاس کی چنائی سے جو ۱,۵۰۰ روپے بچا کر لائی تھی اس رقم کو اپنے گوٹھ کے سامنے واقع ایک زمیندار کی زمین پر سیم (پھلی کی ایک قسم) کی بوائی میں لگا دیے۔ اس سے حاصل ہونے والی پیداوار میں سے آدھا زمیندار کو دیا اور باقی خود بیچ کر ۱,۵۰۰ روپے کمائے۔ ان کے مطابق اس فصل سے ان کو دہرا فائدہ حاصل ہوا جو ۱,۵۰۰ روپے وہ اپنے ساتھ لائی تھیں اگر نقد رقم کی صورت میں رکھتی تو فوراً خرچ ہو جاتی۔ اس طرح سے رقم فصل کی صورت محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ خاندان کے خوراک کا بندوبست بھی ممکن ہو سکا۔

عام خیال یہ ہے کہ پاکستانی محنت کش کاہل ہیں اور محنت کرنے سے گھبراتے ہیں، لیکن اماں لکشمی کی آپ بیتی یہ واضح کرتی ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ امیر طبقہ اپنی طاقت اور امارت کو جائز قرار دینے کے لیے ہمیشہ مزدور کو ہی مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ دیگر ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی مزدور طبقہ انتھک محنت میں جتا ہوا ہے، لیکن اس کی محنت کا پھل سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سرمایہ دار با آسانی اپنے شکنجے میں محفوظ کر لیتا ہے۔ مزدور چاہے مرد ہو یا عورت، جان لیوا محنت کے باوجود دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے حاصل کر پاتا ہے۔ شہروں کے برعکس گوٹھوں میں رہنے والے مزدور کسان کی زندگی کئی حوالوں سے مختلف اور زیادہ مشکل سے دوچار ہے کیونکہ وہ کچی مٹی کی جھونپڑیوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ سرکار ان گوٹھوں میں پانی، بجلی، صحت یا تعلیم کا کوئی انتظام کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی۔ ضروریات زندگی کی یہ اشیاء تو دور کی بات ہے غذا اور پینے کے پانی کا حصول ایک سخت اور مشکل مرحلہ ہے۔ یقیناً اماں لکشمی کی روداد ہمارے ملک کے حکمرانوں کے منہ پر طمانچے سے کم نہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔

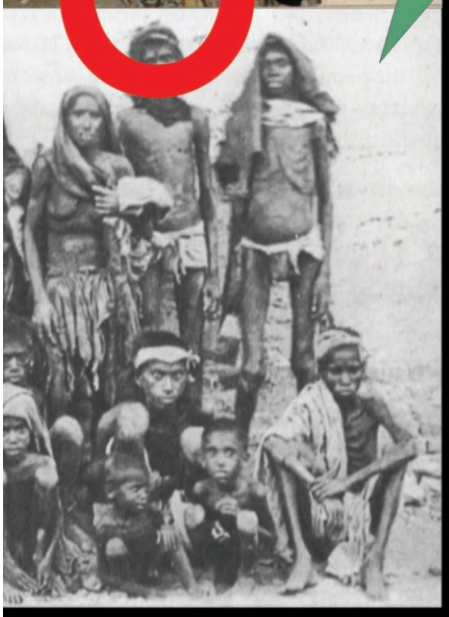

جنگ
WAR
بھوک
قحط
WTO
جنگ، سرمایہ دارای کی ضرورت !

آزاد تجارت
NO
NO
تخلیق: عذرا طلعت سعید
آزاد تجارت = ڈبلیو ٹی او =
خوراک کی حق خودارادیت کی تباہی

برطانوی راج، آزاد تجارت اور قحط

تلخیص ترجمہ: عذرا طلعت سعید

اڈیٹر نوٹ:

چیلنج کے اس شمارے میں مائیک ڈیویس کی کتاب ''لیٹ ویکٹورین ہولوکاسٹس: النینو فیمینز اینڈ دی میکنگ آف دی تھرڈ ورلڈ'' کے دیباچہ، نوٹ برائے وضاحت اور پہلے باب کے کچھ حصوں پر مبنی ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان میں برطانوی راج کے دوران آزاد تجارت اور نوآبادیاتی نظام کی ملی جلی ظالمانہ پالیسیوں پر ایک مکمل اور ٹھوس تنقید پیش کی گئی ہے۔ ان پالیسیوں کے تحت ۱۸۷۶ میں ہندوستان میں واقع ہونے والے قحط کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس کتاب میں بڑی وضاحت سے یہ دیکھایا گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کس طرح قدرِ زائد کی تلاش کے لیے عوام، خاص کر اگران کا تعلق نوآبادیات سے ہو، کو زر کی ہوس کے بھینٹ چڑھاتا ہے۔ ۲۱ ویں صدی کے شروع میں بھوک، خاص کر کے تیسری دنیا کی عوام میں کثرت سے نظر آنے والی کیفیت ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس وقت سرمایہ دارانہ نظام اور اس سے جڑی ہوئی قوتیں جن میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، مختلف ترقیاتی بینک، آئی ایم ایف اور زرعی سرمایہ دارانہ کمپنیاں قابل ذکر ہیں، کو نہیں روکا گیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تاریخ ایک دفعہ پھر سے دہرائی جائے۔ ہمارے خیال میں دورِ حاضر میں آزاد تجارت خاص طور پر ان پالیسیوں کے حوالے سے جو کہ زراعت سے جڑی ہوئی ہیں، کا پرچار کرنے والوں کے لیے، یہ کتاب سوچنے، سمجھنے اور پالیسیوں کا رخ بدلنے کے لیے سبق آموز ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ چیلنج کے ذریعہ اس کتاب کے دیگر حصے اگلے شماروں میں پیش کریں۔

راقم کے مطابق یہ کتاب ''قحط کی سیاسی ماحولیات'' (political ecology of famine) بیان کرتی ہے کیونکہ یہ اپنے اندر ماحولیاتی تاریخ کے علاوہ مارکسسٹ سیاسی معیشت کے نقطہ نظر کا بھی احاطہ کرتی ہے۔

وضاحت

خشک سالی: خشک سالی قدرتی بارش کی کمی بیشی اور زرعی آب پاشی کے نظام کے درمیان ہونے والے انتشار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خشک سالی دو طرح کے عمل کا نتیجہ ہے۔ موسمی خشک سالی کسی بھی علاقے کی اوسط بارش میں مخصوص فیصد کمی کے باعث واقع ہوتی ہے۔ جبکہ ہائیڈرولوجیکل (پانی کی قوت سے چلنے والی) خشک سالی اس وقت واقع ہوتی ہے جب قدرتی (ندی، دریا اور تالاب) اور مصنوعی (تالاب، کوئیں اور نہریں) آب پاشی کے نظام میں پانی کی کمی واقع ہوتی ہے۔ ہائیڈروجیکل خشک سالی کا ہمیشہ ایک سماجی رخ ہوتا ہے۔ مصنوعی آب پاشی کے نظام یقیناً سماجی مدد اور کام کا محتاج ہوتا ہے لیکن قدرتی آب پاشی کا نظام بھی انسانی طور طریقوں سے متاثر ہوسکتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ۱۹ ویں صدی میں آنے والی خشک سالیاں کئی وجوہات پر مبنی تھیں، جن میں سے وسیع زمینی قطعات کی دھیرے دھیرے بربادی، روایتی آب پاشی نظام کی طرف بے توجہی، مقامی آبادیوں کی عمل دخل میں کمی اور پانی کو محفوظ کرنے کے انتظام کی طرف سے حکومت کی چشم پوشی شامل ہیں۔ یوں کہیں کہ اس کتاب کا مرکزی خیال اس سوال کے گرد گھومتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام سے جڑے ہوئے فیصلے، کس حد تک پیداواری نظام میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے کہ بالآخر موسمی تبدیلیاں پیداواری نظام پر اثر انداز ہوگئیں؟

قحط (سبب): ۱۸۶۰ کے دہائی بلکہ اس سے پہلے ہی سے ہندستان میں برطانوی انتظامیہ اور قوم پرست ہندوستانیوں کو یہ علم تھا کہ قحط کی وجہ غذا کی کمی نہیں بلکہ اس گھمبیر معاشی بحران کا نتیجہ ہے جو کہ خشک سالی اور فصل کی بربادی کی وجہ سے منڈی نے پیدا کیے۔ ۱۸۹۹-۱۹۰۲ کے زمانے کی آفت ناگہانی کے بعد مختلف قحط کمیشنوں کی سرکاری رپورٹ کا یہ کہنا تھا کہ ''غلہ ضرورت کے مطابق ہمیشہ موجود تھا اور شدید فقدان کی اصل وجہ زراعت کے شعبے میں ملازمت کی کمی تھی (جس کی وجہ خشک سالی تھی)''۔ کمشنر کا کہنا تھا کہ ''قحط کی وجہ بڑھتی ہوئی قیمتیں تھیں نہ کہ غذا کی کمی''۔ دورِ حاضر کے (مشہور معیشت دان) امرتا سین کا کہنا ہے کہ ''قحط اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کی خوراک تک رسائی نہیں ہے۔ یقیناً قحط کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوراک موجود نہیں۔''[۲] امرتا رنگا سامی نے بھی یہ یاددہانی کرائی ہے کہ ''قحط'' کو صرف فاقہ کشوں کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ شدید بھوک اور فاقہ کشی ہمیشہ طبقاتی نظام میں وسائل کی دوبارہ تقسیم کے عمل سے وابستہ ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں وسائل و فوائد کا بہاؤ معاشرے کے ایک طبقے کی طرف جمع ہوتا ہے اور دوسرے طبقے کی طرف صرف نقصانات''۔[۳]

قحط (اموات): الیگزنڈر ڈوال کا کہنا ہے کہ جو قحط کو ایک واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد طاقت کے رشتے ہیں، جو کہ معاشرے میں موجودہ گروپوں کے درمیان یا گروپوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔[۴] مگر ڈوال اس ''مالتھسین'' خیال کو رد کرتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر عوام میں بھوک کی وجہ سے اموات واقع ہوں تو اس امر کو قحط قرار دیا جائے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قحط کو اس سے بڑے پیمانے پر سمجھا جائے مثلاً جس میں بھوک، غربت اور سماجی نظام کا منتشر ہونا شامل ہے۔ قحط کی یہ وضاحت روایتی افریقی

سوچ کا حصہ ہے۔مغربی سوڈان کے مقامی لوگ غذا کی کمی اور قحط، غربت اور فاقہ کشی کے بیچ میں کوئی وضاحتی دیواریں کھڑی نہیں کرتے۔نہ ان کے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ امیر ممالک ایسا کیوں کرتے ہیں کہ قحط کے لیے امداد بھیجنے بھاگے بھاگے آتے ہیں لیکن فاقہ کشی، جو کہ دنیا میں بچوں کی کل اموات میں سے آدھی کی ذمہ دار ہے، کو اطمینان سے نظرانداز کرتے ہیں۔

اس بنیاد پر کہ قحط جان سے مار دیتا ہے کا اعتراف کرنا ضروری ہے مگر یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ قحط ایک ایسے تسلسل کا حصہ ہے جو کہ ناکافی غذا سے شروع ہوتا ہے اور قحط سے گزرتا ہوا اپنے پیچھے موت کے سائے چھوڑ جاتا ہے جس میں شدید کمزوری اور بیماری متاثرہ آبادیوں میں نظر آتی ہے۔

ہولوکاسٹ (آگ سے اتلاف جان): اس کتاب نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ وہ یہ حقیقت سامنے لائے کہ (ہندوستان میں برطانوی راج کی) سامراجی پالیسیاں فاقہ کش ''رعایا'' کے خلاف اتنا ہی وزن رکھتی ہیں جتنا کہ ۱۸,۰۰۰ فٹ کی بلندی سے بم گرائے جائیں (یہ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے اوپر ایٹمی بم گرائے جانے والے واقعہ کی تشبیہ ہے)۔

حصہ اول: شدید خشک سالی، ۱۸۷۶-۱۸۷۸

ملکہ وکٹوریہ کے ظلم کی شکار رعایا: ۱۸۷۵ کی گرمیوں میں شمالی اور مرکزی ہندوستان میں مون سون کی زیادہ تر بارشیں نہیں ہوئی تھیں۔۱۸۷۶ میں مدراس کے محکمہ موسمیات نے کل ۶ء۳ انچ بارش ریکارڈ کی جب کہ اس سے پچھلی دہائی میں سالانہ اوسط ۶ء۲۷ انچ ریکارڈ کی گئی تھی۔اس سال کی خشک سالی اور انتہائی بڑھی ہوئی قیمتوں کی بنیاد پر دکن اور مدراس ضلع میں عوامی مزاحمت سامنے آئی۔کسان مزدوروں نے پودوں کی جڑ پر انحصار کرنے کی کوشش کے بعد فاقہ زدہ علاقہ چھوڑ کر وہاں سے دوسرے علاقوں میں کھانے کی تلاش میں نکلنا شروع کر دیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہندوستان کے نیم بنجر علاقے تباہی کے لیے بالکل تیار تھے۔عالمی تجارت کی منڈی میں مندی کی وجہ سے غربت اور بے سکونی پھیلتی جارہی تھی۔خاص کر دکن کے ان ضلعوں میں جہاں پر کپاس برآمد کے لیے اگائی جاتی تھی۔ان علاقوں میں جنگلات پر عام آبادیوں کی تحویل کے خاتمے اور اس کے علاوہ دال کی جگہ کپاس کی فصلوں کو ترجیح دینے کی وجہ سے تحفظ خوراک کا مسئلہ پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا۔ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پچھلے تین سالوں میں چاول اور گندم کی پیداوار اوسط درجے سے زیادہ ہوئی تھی لیکن اضافی غلے کو انگلستان برآمد کر دیا گیا تھا۔[۵] یوں کہہ لیں کہ لندن کے شہری ہندوستانیوں کی روٹی کھا رہے تھے۔ایک پریشان شاہد کے مطابق ''یہ ایک عجب بے قائدگی ہے کہ ہندوستان میں قحط موجود ہے لیکن یہاں سے خوراک دنیا کے دوسرے حصوں کو بھیجی جارہی ہے۔''[۶]

اس کے علاوہ دوسری ''بے قائدگیاں'' بھی موجود تھیں۔(برٹش راج کے زمانے میں) نئی نئی ریل کی پٹریوں کو یہ کہہ کر سراہا جاتا تھا کہ وہ حفاظتی اقدامات ہیں جن کی وجہ سے قحط کو روکا جاسکتا ہے۔لیکن تاجروں نے ریل گاڑی کو خشک سالی کے علاقوں سے اناج ہٹانے کے لیے استعمال کیا تاکہ مرکزی گوداموں میں ذخیرہ اندوزی کی جاسکے اور اس کے ساتھ ساتھ بلوہ کرنے والوں کی پہنچ سے بھی دور کیا جاسکے۔اسی طرح ٹیلی گراف کی سہولتوں کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ اناج کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو ہزاروں چھوٹے شہروں میں تار کے ذریعے اطلاع دے کر یکساں کر دیا گیا، چاہے مقامی علاقوں میں رجحان کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔برطانوی حکومت قیمتوں پر قابو سے انحراف رکھتے ہوئے ہر پیسہ رکھنے والے کو دعوت دیتی تھی کہ وہ غلے پر سٹہ بازی کریں۔عام تاجروں کے علاوہ ہر کوئی، جو کہیں سے بھی پیسہ حاصل کرسکتا تھا، اس تجارت میں حصہ لے رہا تھا۔مدراس کے گورنر ڈیوک آف بکنگھم حیران تھے کہ جدید منڈیوں نے کس حد تک قحط کو تیزی سے بڑھانے میں مدد دی۔ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ تھا کہ غذا کی قیمتیں عام مزدوروں، ہاریوں اور مزدور کسان کی پہنچ سے بہت دور ہوگئیں۔جیسا کہ ایک اخبار ''نائین ٹین سینچری'' کے مطابق کمی پیسے اور کام کی تھی نہ کہ غذا کی۔[۷]

ملکہ وکٹوریہ کے پسندیدہ شاعر لارڈ لائیٹن کے زیر سایہ چلائی جانے والی مرکزی (ہندوستانی) حکومت اناج کو ہندوستان کے لیے ذخیرہ کرنے کے قطعی حق میں نہ تھی اور نہ ہی آزاد تجارت کی پالیسی کے تحت منڈی میں کسی قسم کے مداخلت کے قائل تھی۔۱۸۷۶ میں لارڈ لائیٹن (وائسرائے ہند) ملکہ وکٹوریہ کو قیصر ہند کا خطاب دینے کے جشن کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر جشن منایا جائے کہ دو مقاصد پورے ہوجائیں یعنی ''ہندوستانی چمک دمک دیکھ کر مرعوب ہوجائیں'' اور ''تلوار کی کھلی دھار'' جس کے بل بوتے پر ہم راج کرتے ہیں، چھپ جائے۔[۸] یہ جشن ایک ہفتے تک منایا گیا جس میں ۶۸,۰۰۰ افسران، مہاراجاؤں اور گورنروں کے لیے عالمی تاریخ کا سب سے بڑا اور مہنگا ترین کھانا ہفتے بھر کھلایا گیا۔[۹] ایک برطانوی اخبار نویس کے مطابق جن دنوں یہ جشن منایا جارہا تھا ملکہ وکٹوریہ کی رعایا میں سے مدراس اور میسور کے ایک لاکھ افراد فاقہ کشی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔[۱۰]

جشن سے فارغ ہونے کے بعد لارڈ لائیٹن نے اپنی توجہ امیر افغانستان شیر علی سے جنگ کی طرف لگادی۔وہ وسط ایشیاء میں روس کے بجائے انگلستان کو طاقتور دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ان حالات میں بڑھتا ہوا قحط لارڈ صاحب کے لیے صرف الجھن کا سامان تھا کیونکہ ان کو اپنی توجہ افغانستان سے ہٹانی پڑ رہی تھی۔لارڈ سیلس بری (ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ) چاہتے تھے کہ برطانیہ کا جھنڈا درہ خیبر پر لگایا جائے۔لارڈ لائیٹن کے ذمے یہ کام تھا کہ یہ جنگ ہندوستانی عوام سے وصول کیے گئے محصولات سے لڑی جائے نہ کہ برطانوی عوام کے محصولات سے۔اس جنگ پر تبصرہ کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ ''سوچے سمجھے منصوبے کے تحت طاقت کی جنگ'' تھی۔یہ خیال عام تھا کہ لارڈ لائیٹن کا دماغی توازن درست نہیں لیکن اس کے باوجود ان کو قحط کے لیے پالیسی بنانے کے لیے مکمل اختیارات دیے گئے تھے۔آزاد تجارت کے اصولوں کو

اپناتے ہوئے لائیٹن فضول خرچی کے سب سے بڑے دشمن قرار دیے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایسا ہی دیکھتے تھے جیسے کہ وہ دیوہیکل کندھوں پر کھڑے ہوئے ہیں یا کم از کم مقدس ترین مختار کار آدم اسمتھ کی دی ہوئی ہدایات پر مکمل عمل پیرا ہیں۔ آدم اسمتھ نے اپنی تصنیف ''ویلتھ آف نیشنز'' میں بنگال میں ۱۷۷۰ میں شدید ترین خشک سالی و قحط کے حوالے سے کہا ہے کہ ''قحط کبھی کسی اور وجہ سے نہیں ہوتا، سوائے اس کے جب حکومت کی بے تکی پالیسیوں کی وجہ سے (کھانے کی) کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔''[۱۱] ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشہور کالج ہیلی بری میں کئی سالوں تک آدم اسمتھ کی ہدایات کے مطابق سکھایا جاتا رہا کہ حکومت کو قحط کے دوران غلے کی قیمت کو کنٹرول نہیں کرنا چاہیے۔[۱۲] لائیٹن نے سخت ''نیم خدائی ہدایات'' جاری کردی تھیں کہ حکومت اناج کی قیمت میں کمی کرنے کے لیے کسی بھی قسم کا کردار ادا نہیں کرے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر برطانوی عوام انسانی زندگی بچانے کی دیوانگی میں مبتلا ہے تو وہ اس فرسودہ خیال کے لیے اخراجات بھی خود ہی برداشت کریں نہ کہ برطانوی انتظامیہ کا دیوالیہ ہوجائے۔ ۱۸۷۷-۱۸۷۸ کے گھمبیر حالات میں ہندوستان کی فاقہ کشی دور کرنے کے بجائے اناج کے تاجروں نے ۶ء۴ بلین سی ڈبلیو ٹی (cwt) گندم یورپ برآمد کردی نہ کہ وہ اسی گندم کو وہ ہندوستان میں فاقہ کشی دور کرنے کے لیے استعمال کرتے۔[۱۳]

لائیٹن اپنی سخت گیر پالیسیوں کا جواز اس طرح پیش کرتے تھے کہ ہندوستان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ ''اناج کے مقابلے میں آبادی کہیں زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے''۔[۱۴] ان کے خیالات شائد سر ایولین بیرنگ، وزیر خزانہ کے خیالات سے متاثر تھے۔ جن کا کہنا تھا کہ ''قحط اور صفائی کے انتظام کی بہتری کے لیے جو بھی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں ان کا نتیجہ آبادی میں اضافہ اور اس سے جڑی ہوئی شیطانی اثرات کو فروغ حاصل ہوتا ہے''۔[۱۵] ۱۸۸۱ کی ایک رپورٹ کے مطابق ''قحط کے تحت ۸۰ فیصد اموات غریب ترین آبادی، جو کہ عام آبادی کا ۲۰ فیصد حصہ ہیں، میں واقع ہوتے ہیں۔ اگر ان اموات کو روک بھی دیا جائے تو یہ آبادی اپنے آپ کو بڑھنے سے نہیں روک سکے گی۔ اس طرح اگر حکومت قحط کے لیے امدادی رقوم خرچ کرے گی تو غریب آبادی مزید بڑھ جائے گی''۔[۱۶] لارڈ سیلس بری برطانوی راج کے دیگر ارکان کی طرح بالکل نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی غریبوں کے لیے کسی امدادی منصوبے کا آغاز کریں۔ برطانوی راج کے دارالعوام میں اس خیال پر کسی طرح کا اختلاف موجود نہیں تھا کہ ہندوستانی ریاست صرف پیسہ کمانے کا ذریعہ ہے اور یقیناً بھیگ منگوں کا گھر نہیں۔

۱۸۷۷ میں خشک سالی/قحط مدراس پریزیڈنسی کے حدود سے لے کر میسور اور بمبئی دکن اور شمال مغربی صوبوں تک پھیل گیا۔ لاکھوں افراد خوراک کی شدید کمی کی وجہ سے ڈھانچے کی طرح سوکھ گئے تھے۔ اس دوران دیہی افسران اپنے بڑوں کو حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مقامی آبادیوں میں صرف کتے ہی ''بھیڑ کی طرح موٹے'' ہیں جو کہ بچوں کی لاشیں کھاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ بالآخر جب برطانوی امدادی گروہ شولا پور، حیدرآباد میں امداد پہنچانے میں کامیاب ہوئے تو اس سے قبل بہت سے مقامی افراد علاقہ چھوڑ کر جاچکے تھے۔ اس پر حد یہ تھی کہ ایسے فاقہ کش، جو کام کے قابل نہ تھے ان کو امداد نہیں دی جاتی تھی۔ ایک سخت فکرمند اخبار نویس کے مطابق قابل روزگار افراد کی اجرت بھی ناکافی حد سے گر گئی تھی۔ مال مویشی کو بچانے کے لیے گھاس یا چراگاہوں کے انتظام کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی غلہ جمع کیا گیا تھا کہ ضعیف اور ناتواں افراد کی مدد کی جاسکے۔ اس طرح چاہے فاقہ کش جوان ہوں یا بوڑھے یا ناتواں سب کے پاس ایک ہی حل تھا کہ وہ نظام حیدرآباد کے امدادی پروگرام کے لیے حیدرآباد دکن کی طرف چلنا شروع کردیں۔ یہ طویل سفر ایک ایسی آزمائش تھی کہ جس کے اختتام تک زیادہ تر مسافر اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ بے روزگاری اور اناج کی بڑھی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے بھوک کا خوفناک ہیولا ان ضلعوں میں بھی نظر آنے لگ گیا تھا جہاں پر بارش کافی مقدار میں ہوئی تھی۔

لیفٹننٹ گورنر ٹمپل کو لائیٹن نے قحط کے امدادی کام پر لگایا۔ ۱۸۷۳-۱۸۷۴ میں ٹمپل نے بہار میں قحط کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ۵ لاکھ ٹن چاول برما سے منگوا کر کام کے بدلے غذا، امداد کے طور پر تقسیم کی۔ جس کے نتیجے میں آبادی کے ایک بڑے حصے میں قحط سے ہونے والی اموات میں روک تھام ممکن ہوئی۔ ٹمپل کی اس حرکت پر لندن سے ان کو بہت سخت ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اکنامسٹ پرچے میں ان پر یہ کہہ کر تنقید کی گئی کہ انہوں نے کاہل ہندوستانیوں کو یہ سمجھنے میں ترغیب دی ہے کہ ''(یہ برطانوی) حکومت کا کام ہے کہ وہ ان کو زندہ رکھے''۔[۱۷] اعلیٰ سول سروس افسران کا کہنا تھا کہ ''بہت سارے کالے لوگوں کو بچانے کے لیے اتنا پیسہ خرچ کرنا غلطی ہے''۔[۱۸] ٹمپل اپنی پرانی غلطیوں کا ازالہ اپنے نئے عہدے پر آکر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ذمہ اب یہ کام تھا کہ امدادی کام کو گھناؤنا اور بے اثر کرکے پیش کریں۔ (اس کا نتیجہ یہ تھا کہ) ٹمپل ہندوستانی تاریخ میں آزاد تجارت کی معیشت کو عملی جامہ پہنانے والے مثالی شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی لاگو کی گئی پالیسیاں اپنے اندر نوآبادیاتی نظام میں کی جانے والی نسل کشی کو چھپائی ہوئی تھیں۔ ٹمپل نے ۵ لاکھ افراد کو امدادی کام سے ہٹایا۔ جو لوگ کام کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے علاقے سے سفر کرکے دور کیمپوں میں جائیں جہاں پر کام موجود تھا۔ اس طرح ''دوری ٹیسٹ'' (سفر کی آزمائش) ایک طریقہ کار تھا جس کی وجہ سے قابل روزگار بالغ اور بڑے بچے روزگار حاصل نہ کرسکیں۔ بھوک سے پریشان مزدوروں کو اس وقت تک کام نہیں دیا جاتا تھا جب تک کہ ''یہ یقین نہ ہوجائے کہ وہ غریب، بدحال اور بہت کم کام کرنے کے لائق ہیں''۔[۱۹]

لائیٹن نے ٹمپل کو یہ کام اس لیے سونپا تھا کہ امدادی کام میں ''قابو سے باہر'' خرچ ہونے والے رقوم سختی سے روک دی جائے تاکہ افغانستان پر (برطانیہ کی طرف سے) ہونے والے حملے کے لیے جو سرمایہ درکار ہے وہ قحط کو زائل کرنے کے لیے خرچ نہ ہوجائے۔ امداد کے کام میں دی جانے والی غذا جو کہ ''ٹمپل دہاڑی'' کے نام سے پہچانی جاتی تھی (وہ ہٹلر کے زمانے کے) بشن والڈ نامی بیگار کیمپ میں سخت کام کے بعد دی جانے والی خوراک سے بھی کم تھی۔ ٹمپل دہاڑی آج کل کے زمانے میں بالغ

ہندستانی مردوں کے لیے تجویز کردہ غذایا معیاری توانائی کی آدھی سے بھی کم تھی۔اس کے علاوہ ٹمپل نے اینٹی چیریٹیبل کونٹری بیوشن ایکٹ ۱۸۷۷ میں رائج کیا۔اس قانون کے تحت، ایسی نجی امداد جس کا اثر منڈی میں اناج کی قیمت پر پڑے، تو امداد دینے والے کو قید کیا جاسکتا تھا۔(مدراس کے گورنر) بلنگم قحط کی شدت کی وجہ سے عوام کو ان کے ادا کردہ زمین کا لگان واپس کررہے تھے لیکن ٹمپل نے بلنگم پر پابندی عائد کردی کہ وہ ان محصولات کو واپس نہ کریں۔اب ٹمپل کا کہنا تھا کہ ''قحط قابو میں ہے''۔اس زمانے کے انقلابی اخبار نویس ڈیگبی کا جواب تھا کہ ایک چوتھائی لوگوں کے مرنے کے بعد بہرحال یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ قحط قابو میں ہے۔[۲۰] ٹمپل کا کہنا تھا کہ قحط کے زیادہ تر شکار وہ لوگ تھے ''جو دوسروں پر پلنے والے بھکاری تھے اور ان کی موت کا غم کم ہی لوگ کریں گے کیونکہ یہ زیادہ تر کاہل اور مجرموں میں سے تھے۔''[۲۱] اس قسم کی تہمت بازیوں نے ہر طبقے کے ہندوستانی کو غصے سے دوچار کیا۔فاقہ زدہ مزدور کسانوں نے امدادی کام کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اس میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔اس امدادی ہڑتال کو ایک معتدل قوم پرست گروہ سروا جانک سبا نے بھی اپنا لیا۔اس گروہ میں معزز مقامی تاجر، جاگیردار اور پیشہ ور افراد بھی شامل تھے۔اس کے علاوہ ڈیگبی جیسے اخبار نویس آئیرلینڈ میں (برطانوری راج کے زیر سایہ) ہونے والے قحط اور ہندوستان میں سپاہیوں کی بغاوت کی یاد مستقل تازہ کرتے رہتے تھے۔مختلف اصلاح پسندوں نے بھی ہندوستان میں اپنائی جانے والی بے رحم پالیسیوں کے خلاف ٹائمز جیسے اخبارات میں شکایت درج کیں۔ان سب کا نتیجہ تھا کہ لائیٹن کو حکم دیا گیا کہ وہ امدادی کام کی سختی میں کمی پیدا کرتے ہوئے قحط سے مرنے والوں کی تعداد کو قابو کریں۔معیانہ رومبران سبا بھی اس اصلاح پسند حکمت عملی کے بعد خاموش ہوگئے۔

یہ اصلاحات ناکافی تھیں اور تاخیر سے کی گئیں۔۱۸۷۷ میں برما اور بنگال میں چاول کی فصل حسب معمول تھیں اور اناج کا ذخیرہ اتنا تھا کہ برآمدی ضروریات پوری کردی گئی لیکن ۳۶ ملین فاقہ کش ہندوستانی دیہاتیوں کو ان ذخیروں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں تھا۔جیسے جیسے خشک سالی بڑھتی گئی رہے سہے پانی کے وسائل خشک ہونا شروع ہوگئے یا پھر انسانی فضلہ سے آلودہ ہوکر ہیضہ کی بیماری کو وباء کی طرح پھیلانے میں مدد گار ثابت ہوئے۔مدراس کے کچھ اضلاع کی رپورٹوں کے مطابق ۱۵ لاکھ افراد قحط کے ہاتھوں ختم ہوچکے تھے۔۱۸۷۷ کی گرمیوں میں میسور میں قحط کی وجہ سے عورتیں اور بچے غلہ چوری کرنے کی کوشش کرتے تھے تو ان پر مہر لگادی جاتی تھی۔اس کے علاوہ تشدد کا نشانہ بنا کر ان کی ناک کاٹ دی جاتی تھی اور کچھ کو جان سے ماردیا جاتا تھا۔

بالآخر ستمبر، اکتوبر میں جاکر جنوبی ہندوستان میں مون سون کی بارشوں نے خشک سالی کا اثر کم کیا۔ان حالات میں دکن کے مزدور کسانوں کے خلاف دوسرا زبردست حملہ یہ تھا کہ ان سے وہ سارے محصولات حاصل کرنے کی مہم چلائی گئی جو کہ خشک سالی کے دوران ادا نہیں کیے گئے تھے۔۱۸۷۹-۱۸۸۰ میں جبر کے تحت ۷۸ فیصد محصولات حاصل کیے گئے۔مزدور کسان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زرعی زمینوں کی نیلامی سے یقیناً امیر کسانوں اور بنیوں نے بہت فائدہ اٹھایا جو کہ وہ پہلے بھی ان کے جانور سستی قیمتوں میں خرید کر حاصل کرچکے تھے۔اس طرح زرعی معیشت جو کہ ہمیشہ سے چھوٹے کاشتکار کی ہمت پر پھلتی پھولتی تھی، تباہ ہوکر رہ گئی۔[۲۲]

۱۸۷۸ میں شمال مغربی ہندوستان میں بارش کی کمی کی وجہ سے بے تحاشہ اموات واقع ہوئیں۔مورخین کا خیال ہے کہ یہ اموات ایسی سوچی سمجھی پالیسیوں کا نتیجہ تھیں جو کہ روکی جاسکتی تھیں۔۱۸۷۴-۱۸۷۶ میں جنوبی ہندوستان کے برعکس شمالی ہندوستان میں فصل کی پیداوار بھاری مقدار میں ہوئی تھیں لیکن اس علاقے کو برآمدی پیداوار کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔حالانکہ یہاں کے کسان عام طور پر فصل صرف اپنے استعمال کے لیے اگاتے تھے۔۱۸۷۶-۱۸۷۷ میں انگلستان میں فصل کی کم پیدا اور اناج کی بڑھی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے، شمالی ہندوستان میں پیدا ہونے والی گندم انگلستان پہنچادی گئی۔اس فصل کا منافع زمیندار، بنیوں اور اناج کے تاجروں نے ہتھیا لیے نہ کہ ان مزدور کسانوں کو ملتا جنہوں نے فصل اگائی تھی۔صوبے کے افسر اعلیٰ سر جارج کوپر نے لائیٹن سے یہ درخواست کی کہ وہ کسانوں سے اس سال کی آمدنی پر محصولات حاصل نہ کریں لیکن لائیٹن نے درخواست کو افغانستان کی (جنگی) ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے رد کیا۔کوپر نے لائیٹن کے احکامات کی بجاآوری کو پورا کرتے ہوئے مسائل میں گھرے زمینداروں اور ان کے فاقہ زدہ ہاریوں پر سختی کرنا شروع کردیا۔مزدور کسانوں کی مزاحمت کرنے پر کوپر نے جیلوں کو ان سے بھر دیا۔صرف ۱۸۷۷ کے اگست، ستمبر میں، اناج کے حوالے سے ۱۵۰ شدید مزاحمتیں ہوئیں۔آنے والی سردیوں میں ہزاروں افراد قحط کے شکار ہوئے۔مردہ اور نیم مردہ دیہات کی سڑکوں پر پڑے ہوئے پائے جاتے تھے۔لاشوں کو پرانے کنوؤں میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اموات کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں میں دفنانے کی ہمت نہیں تھی۔[۲۳]

لائیٹن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ برطانوی دارالعوام میں کچھ انقلابی سوچ رکھنے والے اس کوشش میں تھے کہ دولت ٹیکس اور فوجی اخراجات میں کمی کرکے امدادی قحط فنڈ کا انتظام کیا جائے۔لائیٹن نے اس سوچ کو بڑھنے سے روکنے کے لیے ''قحط انشورنس فنڈ'' کی پالیسی پیش کی۔جس کے تحت چھوٹے ہندوستانی تاجروں پر لائسنس فیس لاگو کردی گئی۔اس کے علاوہ نمک کے اوپر سخت محصولات لگادی گئیں۔جس کے نتیجے میں مدراس اور بمبئی میں نمک کی فی من قیمت دو آنے سے بڑھ کر ۴۰ آنے ہوگئی۔دراصل یہ فنڈ ایک ڈھکوسلہ تھا اور اس کا اصل مقصد کپاس سے بنی ہوئی مصنوعات پر محصولات کم کرنا اور افغانستان پر حملے کے لیے مالیاتی اخراجات پورے کرنا تھے۔فنڈ میں بدعنوانی کے ساتھ ساتھ دوسرا حربہ قحط کمیشن رپورٹ تھی جس کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا کہ اس سانحہ کی مکمل ذمہ داری سے حکومت کو بری الذمہ کردیا گیا۔رپورٹ کا کہنا تھا کہ قحط کی اصل وجہ خشک سالی تھی جس کی وجہ سے غذائی فصلیں نہ ہوسکیں جن پر کہ عوام انحصار کرتی ہے۔اس رپورٹ پر یوں تنقید کی گئی کہ ''قحط کو 'قدرتی قانون' کے طور پر پیش کرکے یوں ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس میں انسانوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے''۔[۲۴] ایک مشہور پارسی پروفیسر نوروجی کے مطابق ''عجیب بات ہے کہ برطانوی حاکموں کو یہ نظر نہیں آتا کہ وہ خود خشک سالی کی وجہ ہیں۔ہندوستانیوں کی تکلیف، فاقہ کشی اور لاکھوں اموات کی اصل

وجہ یہ ہے کہ (ولایتی) یہاں کی دولت کو باہر لے جاتے ہیں۔ . . پھر اپنی غلطیوں کے لیے بے چاری قدرت کو کیوں موردالزام ٹھہراتے ہو"[۲۵]۔

حوالہ جات

۱۔ڈیویس، مائیک۔"لیٹ وکٹورین ہولوکاسٹس: النینو فیمینز اینڈ دی میکنگ آف دی تھرڈ ورلڈ"۔ورسو،۲۰۰۱۔

۲۔امرتا سین،"پاورٹی اینڈ فیمن: این ایسے آن اینٹائٹل منٹ اینڈ ڈیپریویشن،"آکسفورڈ،۱۹۸۴،صفحہ ۱۔اس کے علاوہ دیکھیں: میگناد دسائی،"دی اکانومکس آف فیمن،" ایڈیٹر جی ہیریسن،"فیمن"، آکسفورڈ ۱۹۸۸،۔

۳۔امرتا رنگاسامی،"فیلیئر آف ایکسچینج اینٹائیٹل منٹس' تھیوری آف فیمن: اے ریسپونس،" ایکانومک اینڈ پولوٹیکل ویکلی،۴۱:۲۰(۱۲، اکتوبر ۱۹۸۵)،صفحہ ۱۷۸۔

۴۔ڈوال، الیگزنڈر،"فیمن دیٹ کلز: ڈارفور، سوڈان،۱۹۸۴۔۱۹۸۵،" آکسفورڈ ۱۹۸۹،صفحہ ۱۰۶۔

۵۔برٹش پارلیمنٹری پیپرز،"رپورٹ آف دی انڈین فیمن کمیشن، پارٹ ۱، فیمن ریلیف،" سی ڈی،۲۵۹۱،لندن ۱۸۸۰،صفحہ ۱۹۱۔

۶۔وال فرڈ، کارنیلس،"دی فیمنز آف دی ورلڈ،" لندن،۱۸۷۹،صفحہ ۱۲۶۔

۷۔"دی نائین ٹین سینچری،" ستمبر ۱۸۷۷،صفحہ ۱۷۷۔

۸۔رابرٹس، اینڈریو،"سیلزبری: وکٹورین ٹائیٹن، لندن،" ۱۹۹۹،صفحہ ۲۱۵۔

۹۔ڈیگبی، ولیم،"دی فیمن کمپین اِن سدھرن انڈیا: ۱۸۷۶۔۱۸۷۸،" والیوم ۱،صفحہ ۴۶۔

۱۰۔راؤ، نیلن کنتھس ورا،"فیمنز اینڈ ریلیف ایڈمنسٹریشن: اے کیس اسٹڈی آف کوسٹل اندھرا،۱۸۵۸۔۱۹۰۱،" نیو دہلی،۱۹۹۷،صفحہ ۱۲۰۔

۱۱۔اسمتھ، آدم،"این انکوائری اِن ٹو دی نیچر اینڈ کوزیز آف دی ویلتھ آف نیشنز (۱۷۷۶)،" ففتھ ایڈیشن، لندن ۱۹۳۰،صفحات ۲۷۔۲۸۔

۱۲۔امبراجان، ایس،"کلاسکل پولیٹیکل ایکانومی اینڈ برٹش پالیسی اِن انڈیا،" کیمبریج ۱۹۷۸،صفحہ ۶۳۔

۱۳۔بھاٹیہ بی،"فیمنز اِن انڈیا،۱۸۵۰۔۱۹۴۵،" ٹیبل ۵، بمبئی، صفحہ ۳۸۔

۱۴۔جون کیلڈ ول کی کتاب "مالتھس اینڈ دی لیس ڈیولپیڈ ورلڈ: دی پائیوٹیل رول آف انڈیا" سے لیا گیا ہے۔"پاپولیشن اینڈ ڈیولپمنٹ ریویو" ۲۴:۴ دسمبر ۱۹۹۸،صفحہ ۶۸۳۔

۱۵۔"پارلیمنٹری پیپرز،" ۱۸۸۱،۶۸،"فیمن کمیشن۔فائننشل اسٹیٹ منٹ،" جو لیا گیا ہے شیلڈن واٹس کی کتاب "اپی ڈیمکس اینڈ ہسٹری: ڈزیز، پاور اینڈ امپریل ازم،" نیو ہیون، کانیکٹیکٹ،۱۹۹۷،صفحہ ۲۰۳۔

۱۶۔جون کیلڈ ول کی کتاب "مالتھس اینڈ دی لیس ڈیولپیڈ ورلڈ: دی پائیوٹیل رول آف انڈیا،" صفحہ ۶۸۳

۱۷۔"دی اکانومسٹ،" ۳۲ (جولائی ۱۸۷۴)،صفحہ ۸۰۲۔

۱۸۔امبراجان، ایس،"کلاسکل پولیٹیکل ایکانومی اینڈ برٹش پالیسی اِن انڈیا،" صفحہ ۹۲۔

۱۹۔راؤ، نیلن کنتھس ورا،"فیمنز اینڈ ریلیف ایڈمنسٹریشن، صفحہ ۱۱۸۔

۲۰۔ ڈیگبی، ولیم،"دی فیمن کمپین ان سدھرن انڈیا، ولیم ۲،صفحات ۲۴۷ اور ۲۵۲۔

۲۱۔ "دی انڈین فیمن: ہاؤ ڈیلٹ ویدھ اِن ویسٹرن انڈیا،" صفحہ ۱۵۳۔

۲۲۔ راجہ شیکھر، ڈی،"فیمنز اینڈ پھیزنٹ موبیلیٹی: چینجنگ ایگریرین اسٹرکچر ان کرنورڈسٹرکٹ آف آندھرا،۱۸۷۰۔۱۹۰۰،" آئی ای ایس ایچ آر ۲:۲۸ (۱۹۹۱)،صفحہ ۱۴۳۔

۲۳۔اوسبون، آر،"انڈیا انڈر لارڈ لائیٹن،" کنٹیمپو ریری ریویو، دسمبر ۱۸۷۹،صفحہ ۵۶۴۔

۲۴۔ ہنڈمین، ایچ، ایم، دی بینک رپسی آف انڈیا، لندن،۱۸۸۶،صفحہ ۲۶۔

۲۵۔ نوروجی، دی، پاورٹی اینڈ اَن برٹش رول اِن انڈیا، لندن،۱۹۰۱،صفحات ۶۰ اور ۱۴۱۔

بات تو سچ ہے مگر.....

امدادی قیمت صرف کپاس اور گندم تک محدود کرنے کا اعلان

وفاقی وزیر خوراک و زراعت نے کہا ہے کہ حکومت نے کپاس اور گندم کے لیے امدادی قیمت کی پیش کش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کپاس کے لیے سرکاری قیمت خرید ۸۰۰ روپے فی من مقرر کی گئی ہے۔ ڈان، یکم، اکتوبر ۲۰۰۲

گندم کی زیادہ پیداواری لاگت اور کم قیمت کا مسئلہ

کسانوں کی ایک تنظیم (فارمرز ایسوسی ایشن آف پاکستان) نے گندم کی زیادہ پیداواری لاگت کے پیش نظر سرکاری قیمت میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے۔ تنظیم نے ۴۰ کلوگرام بوری کی قیمت ۳۰۰ روپے سے بڑھا کر ۳۵۰ روپے کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ کسان بورڈ نامی تنظیم نے بھی اس مطالبے کا دفاع کیا ہے۔

حکومت نے جب گندم کی قیمت ۲۶۵ روپے فی ۴۰ کلوگرام سے بڑھا کر ۳۰۰ روپے کی تھی تو کسانوں کو کسی قدر سکون حاصل ہوا تھا۔

۱۹۹۹ میں ڈیزل ۱۲ روپے فی لیٹر دستیاب تھا لیکن اس کے بعد اس کی قیمت میں تقریباً دگنا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت ڈیزل کی قیمت ۲۲ روپے فی لیٹر ہے۔ نہری پانی میں کمی نے بھی کسانوں کو مجبور کیا کہ وہ آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل کا استعمال کریں۔ ٹیوب ویل جو کہ بجلی سے چلتی ہے، اس طرح بجلی کی بڑھی ہوئی قیمتیں کسانوں کے لیے باعث مسئلہ ہیں۔ ۱۹۹۹ سے اب تک بجلی کی قیمت میں اوسطاً دس گنا اضافہ ہوا ہے۔

اسی طرح یوریا کھاد کی قیمت میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۹۹ میں ایک بوری یوریا کی قیمت ۲۶۰ روپے تھی جو اب ۴۲۰ روپے ہے۔ کسان عموماً ایک ایکڑ گندم کی فصل پر تین سے چار بوری یوریا استعمال کرتے ہیں۔ پوٹاش (ڈی اے پی) کی قیمت ۴۵۰ روپے فی بوری سے بڑھ کر ۶۵۰ روپے فی بوری ہوگئی ہے۔ ۱۹۹۹ میں ۳۰۰ روپے کی سرکاری قیمت خرید جہاں مناسب دکھائی دیتی تھی وہاں ۲۰۰۳ میں یہ بالکل نا مناسب دکھائی دے رہی ہے۔

اس وقت گندم کی فصل کھیتوں میں ابتدائی مرحلے میں ہے۔ گندم کی سرکاری قیمت اس کے بوائی کے وقت طے ہونی چاہیے۔ جس کا کسانوں پر بہتر اثر پڑے گا۔ اب بھی موقع ہے کہ گندم کے سرکاری نرخ بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کی خریداری کی کوششوں کو یقینی بنایا جائے۔ ڈان، یکم، فروری ۲۰۰۳

خوردنی تیل پیدا کرنے والی فصلوں کی کاشت میں حکومتی دلچسپی

حکومت نے خوردنی تیل پیدا کرنے والے بیجوں خصوصاً کنولا کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک ہنگامی منصوبہ شروع کر دیا ہے تاکہ خوردنی تیل کی ملکی ضروریات کو پورا کر کے اس کی درآمد پر خرچ ہونے والے قیمتی زرمبادلہ کو بچایا جا سکے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق خوردنی تیل کی قیمتوں کے بارے میں عوامی آگہی پیدا کی جائے گی تاکہ کاشتکاروں کو ان کی صلاحیت کے استعمال کے ذریعے انہیں پیداوار بڑھانے پر راغب کیا جا سکے۔

وزارت خوراک و زراعت سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کنولا کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے مناسب اقدامات کرے تاکہ کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے اور ان کے منڈی سے متعلق مسائل حل کیے جا سکیں۔ ڈان، ۱۹، اکتوبر ۲۰۰۲

حکومت ملک میں کپاس، تمباکو جیسی غیر غذائی فصلوں کے بعد اب خوردنی تیل کی درآمد پر خرچ ہونے والے زرمبادلہ کو بچانے کے لیے ملک میں کنولا، سویابین، سورج مکھی اور ناریل کی کاشت بڑھانا چاہتی ہے۔ اس وقت ملک اپنی ضروریات کے ۱۷ لاکھ ٹن میں سے ۱۱ لاکھ ٹن خوردنی تیل درآمد کرتا ہے جس پر زرمبادلہ کی کثیر رقم خرچ ہوتی ہے اور حکومت اسی زرمبادلہ کو بچانے کے فکر میں ہے۔ لیکن اس کے دوسرے پہلو بھی قابل غور ہیں۔ اس سے ملک کے اندر غذائی فصلوں کے زیر کاشت رقبہ میں کمی پیدا ہوگی۔ سویابین اور کنولا جیسی غیر ملکی فصلوں کی کاشت سے مقامی زرعی تنوع متاثر ہوگی۔ اجنبی فصلوں کے بیج اور اس کے ساتھ کیڑے مار ادویات اور کھاد زرعی اور کیمیائی منافع جات میں اضافے کا سبب بنیں گے۔ اس میں جینیاتی بیجوں کی کاشت کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح خوردنی تیل پیدا کرنے والی فصلوں سے ایک طرف پہلے سے موجود تحفظ خوراک کا مسئلہ مزید سنگین ہو جائے گا اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر ماحولیاتی بگاڑ پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔

کارپوریٹ فارمنگ کے پیکج کے لیے مفاہمتی دستاویز پر دستخط

کارپوریٹ فارمنگ پیکج پر پاکستانی حکومت کی تین وزارتوں نے مل کر دستخط کیے ہیں۔ ان وزارت میں وزارت محنت و افرادی قوت و سمندر پار پاکستانی، وزارت صنعت و پیداوار اور وزارت خوراک و زراعت اور مال مویشی شامل ہیں۔ ان وزارتوں نے کابینہ کے کارپوریٹ فارمنگ کے فیصلے کی پالیسی کے روشنی میں مشترکہ طور پر مفاہمتی دستاویز تیار کیا تھا اور اب اس پر دستخط کیے ہیں۔

ان وزارتوں نے سرکاری اور نجی شعبے کے ماہرین پر مشتمل تکنیکی بنیادوں پر ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی تھی جس نے زرعی پیداوار اور منڈی کی مخصوص خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے کارپوریٹ فارمنگ کے لیے مناسب مزدور قوانین کا پیکج تیار کیا ہے۔

پیکج، کارپوریٹ فارمنگ کے لیے سرمایہ کاری بورڈ کی طرف سے اعلان ہونے والی پالیسی کا حصہ ہوگا۔ کارپوریٹ فارمنگ کے لیے خاص طور پر تیار کردہ مزدور قوانین کے پیکج میں مزدوروں کے لیے شرائط وضوابط، اجرت اور معاوضہ، مزدوروں کے لیے حادثات کا ازالہ اور فلاح و بہبود جیسے اقدامات شامل ہیں۔

ان قانونی ضابطوں کے تحت مزدور کو کام پر رکھتے ہوئے اس کی ملازمت کو تحریری صورت میں بیان کیا جائے گا۔ جس میں شرائط وضوابط کے مطابق ایک ہفتے میں زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے کام لینے کی پابندی انتظامیہ کی طرف سے متعین ہوگی۔

مزدور کو انتظامیہ کی طرف سے مقررہ تاریخ پر تنخواہ ملے گی۔ کل وقتی مزدور کا معاوضہ ۲,۰۰۰ روپے ماہوار سے کم نہ ہوگا۔ یہ معاوضہ نقد یا پھر مالک اور ملازم کے باہمی طور پر طے کیے جانے والے معاہدے کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے۔

دی نیوز، ۱۳، نومبر ۲۰۰۲

کارپوریٹ فارمنگ ملک میں جدید سرمایہ دارانہ زرعی پالیسیوں کے نفاذ میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس طریقہ زراعت کا ایک اہم مقصد مزارعین، چھوٹے اور درمیانے کسانوں کا خاتمہ ہے۔ عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ایشیائی ترقیاتی بینک کا موقف ہے کہ مزارعین اور چھوٹے کسان دقیانوسی ہیں اور روایتی طریقہ زراعت ''فرسودہ'' ہے جس سے زرعی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ گھر کے تمام افراد کے زراعت میں حصہ لینا ان اداروں کے نزدیک افرادی قوت اور محنت کا زیاں اور دیہی غربت کی اہم وجوہات میں سے ہے۔

ان حالات کے پیش نظر حکومت نے جون ۲۰۰۲ میں کارپوریٹ فارمنگ ایکٹ کی باقاعدہ منظوری دے دی۔ اسی منصوبہ کے تحت گھریلو زراعت سے منسلک چھوٹے کسانوں اور مزارعین کو ''زرعی مزدور'' بنانے کے لیے مندرجہ بالا اقدامات کیے گئے ہیں۔

اس طرح دیہی علاقوں کا ایک بہت بڑا حصہ زراعت سے علیحدہ کردیا جائے گا اور وہ کارخانوں میں مزدوری کرنے والوں کی طرح کام پر جایا کریں گے۔ غذا اب کمپنیاں پیدا کریں گی اور کسان ان کے خریداروں میں شامل ہوجائیں گے۔ لیکن یورپ اور امریکہ کے برعکس زراعت، ایشیاء اور افریقہ کی طرح ہمارے ملک میں بھی کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ یہ عوام کے تحفظ خوراک کا اہم ذریعہ ہے اور ایک ثقافتی درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس طرح یہ ایک طرز زندگی کا نام ہے۔ جس سے پورے سماج اور ماحول کا توازن جڑا ہوا ہے۔

کارپوریٹ فارمنگ کے نفاذ سے ایک بہت ہی بڑی آبادی دیہات سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگی اور شہر کے گرد کچی آبادیوں میں اضافہ ہوگا۔ بیروزگاری اور غربت مزید بڑھے گی۔ کارپوریٹ فارمنگ میں غریب مزدوروں کی تنخواہ صرف ۲,۰۰۰ روپے رکھی گئی ہے جو کہ زراعت سے علیحدہ کیے گئے خاندان کی کفالت کے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔ تجویز کردہ رقم صنعتی مزدور کی کم از کم ماہانہ اجرت سے بھی کم ہے!

کارپوریٹ فارمنگ: جنگلات بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے

سندھ کے سیکریٹری جنگلات اور ماحولیات کے مطابق کچے کے علاقے میں واقع ۲ء۲ ملین ایکڑ زمین غیر ملکی کمپنیوں کو کارپوریٹ فارمنگ کے غرض سے پٹے پر دی جائیگی۔ یہ متنازعہ فیصلہ ایک طرف ماحول اور دوسری طرف بے زمین ہاریوں کے مقدر سے جڑا ہوا ہے۔ کچے کی زمین کو غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کرنے سے وہ جنگلات بھی ختم ہوجائیں گے جو دریائے سندھ کے کنارے پر گدو سے لیکر کھاروتک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بہت بڑی ماحولیاتی تباہی ہوگی جسے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔

مزید یہ کہ غیر ملکی کمپنیوں سے زیادہ سندھ کے دیہات کے بے زمین مزدور کسان کچے کی زمین کے حقدار ہیں۔ جہاں تک ترقی پزیر ممالک کے عوام کا تعلق ہے تو بین الاقوامی کمپنیوں کا کردار کبھی بھی قابل تعریف نہیں رہا ہے۔ زرعی شعبے میں بین الاقوامی کمپنیوں کے داخل ہونے سے مقامی کسان آبادی کی حیثیت کمزور ہوجائے گی۔ غیر ملکی کمپنیاں فصلوں کے علاوہ قیمتوں اور مقامی منڈی کا انتخاب بھی کرسکیں گی اور ہمارے زرعی تنوع کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس طرح زرعی شعبے پر مقامی کاشتکار کی گرفت نہیں رہے گی۔

حکومت کو کچے کے جنگلات نہیں مٹانے چاہیے کیونکہ یہ نہ صرف ماحول کے لیے اہم ہیں بلکہ یہ اس علاقے کے رہنے والوں کے خوراک کا ذریعہ بھی ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ بین الاقوامی کمپنیوں کو زمین پٹہ پر دینے کے ارادے کو ترک کردے تاکہ خطرناک نتائج سے بچا جاسکے۔

ڈان، ۲۷، دسمبر ۲۰۰۲

جینیاتی فصل پر پابندی کا مطالبہ

رائس ایکسپورٹ ایسوسی ایشن پاکستان (آر ای اے پی) جینیاتی طور پر تیار کردہ باسمتی چاول کے خلاف ہے اور اس نے وزارت خوراک وزراعت پر زور دیا ہے کہ وہ اس کی کاشت پر فوری پابندی عائد کرے۔

ایسوسی ایشن نے واضح کیا ہے کہ حال ہی میں ''جینیاتی طور پر تیار کردہ پیداوار'' پر دنیا کے بہت سارے ممالک نے پابندی عائد کردی ہے۔ آر ای اے پی نے مزید کہا کہ ''جینیاتی طور پر تیار کردہ'' یا جی ایم غذائی فصلوں کی کامیابی قصہ کہانیوں سے زیادہ نہیں۔ تنظیم نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ قدرتی یا عام دھان کی ملک سے دنیا کے دیگر ممالک کی منڈیوں کو برآمد کی حوصلہ افزائی کرے۔

ڈان، ۲۰، نومبر ۲۰۰۲

آر ای اے پی نے بہت دور اندیشی سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ سے پیدا کیا ہوا چاول ملک میں نہیں اگایا جائے۔ دنیا کے کئی ممالک میں اس طرز پیداوار کی شدید مخالفت ہے۔ اس پیداوار کو اگر فروغ دیا گیا تو یہ باسمتی چاول کے علاوہ دیگر اقسام کی فصلوں پر منفی اثرات کے ساتھ ساتھ شدید ماحولیاتی خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک کا دوغلا پن

پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ایشیائی ترقیاتی بینک (اے ڈی بی) کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے وزیراعظم پاکستان کے مالیاتی مشیر کے ہمراہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایشیائی ترقیاتی بینک نے ملک کے زرعی شعبے میں پیداوار بڑھانے کی خاطر دی جانے والی زرعی چھوٹ یا اعانت کی مخالفت نہ کرنے پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔ بینک کے اعلیٰ عہدیدار کے بقول ''ہم زرعی شعبے کو دی جانے والی کسی بھی ایسی اعانت کی مخالفت نہیں کریں گے جو کہ متعین کردہ اور بامعنیٰ ہو''۔

ڈان، ۳۰، جنوری ۲۰۰۳

ایشیائی ترقیاتی بینک کا زرعی شعبے کے جائزے کے لیے قرضہ

ایشیائی ترقیاتی بینک نے پاکستان کو تکنیکی معاونت کے لیے ۷ لاکھ ڈالرز کا قرضہ دیا ہے۔ اس قرضہ کا مقصد زرعی کاروبار کی ترقی کے منصوبہ کے قابل عمل ہونے پر تحقیق ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک (اے ڈی بی) کے ذرائع کے مطابق تکنیکی معاونت کا مقصد حکومت کے زرعی کاروبار میں نجی شعبے کے کردار کو بڑھانے کے منصوبے میں مدد فراہم کرنا ہے۔ بینک کے مطابق مجوزہ تحقیق کو دو مرحلوں میں مکمل کیا جائے گا۔ پہلے مرحلے میں زرعی کاروبار کے شعبے کی صلاحیت اور رکاوٹوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

دوسرے مرحلے میں پہلے مرحلے کی تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے زرعی کاروبار کو ترقی دینے کے لیے طریقہ کار وضع کرنا ہے۔

ڈان، ۳، جنوری ۲۰۰۳

فصلوں کے لیے چھوٹ پر بینک کے موقف میں نرمی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ شائد بینک کے مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ اسی لیے اخبارات نے اس خبر کو اہمیت دیتے ہوئے اداریے تک لکھ ڈالے۔ جس میں لکھا ہے کہ آخر کار پاکستانی حکام قرضہ فراہم کرنے والے ایک اہم ادارے ایشیائی ترقیاتی بینک کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ زرعی شعبے کی ترقی، معاشی ترقی کے لیے کتنی ضروری ہے۔

اول تو جس انداز میں بینک کے سربراہ نے بیان دیا ہے اس سے ہی شکوک وشبہات جنم لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ کسانوں کو دی جانے والی چھوٹ کی مخالفت اس صورت میں نہیں کی جائے گی جب چھوٹ ''بامعنیٰ اور خاص متعین مقصد'' کے لیے ہو۔ اسکا واضح مطلب آزاد معاشی پالیسیوں پر عمل درآمد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک دیگر مالیاتی اور تجارتی اداروں کی طرح عالمی کمپنیوں کے مفادات کے لیے جس طرح راہ ہموار کررہا ہے اس کا اندازہ ''تکنیکی تحقیق کے مد میں دی جانے والی امداد'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ ملک کی زرعی منڈی کی معلومات زراعت کی تجارت کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے کیے جانے کا خدشہ ہے!

مکمل صاف پانی کی فراہمی ممکن نہیں

حیدرآباد کے فراہمی آب ونکاسی کے ادارے ڈبلیو اے ایس اے (واٹر اینڈ سینی ٹیشن ایجنسی) کے سربراہ نے کہا ہے کہ پینے کے لیے سو فیصد صاف پانی کی فراہمی ادارے کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ادارے کے سربراہ نے حیدرآباد کے ضلعی کونسل کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس معاملہ کو ہنگامی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ صورت حال بدتر ہونے کی وجہ سے عوام کو پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ حیدرآباد کے لوگوں کو روزانہ ۶۰ ملین یومیہ گیلن پانی کی ضرورت ہے جس کے لیے واسا (ڈبلیو اے ایس اے) کو کم از کم پانی صاف کرنے والے دو فلٹر پلانٹ درکار ہیں۔

دی نیوز، ۲۹، جنوری ۲۰۰۳

پانی ایک بہت ہی اہم انسانی ضرورت اور بنیادی انسانی حق ہے۔ اسی لیے ملک کے تمام شہریوں کو پینے کے صاف پانی کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ملک کے زیادہ تر دیہات پہلے ہی اس بنیادی انسانی حق سے محروم ہے جبکہ بڑے شہروں کی صورت حال کی عکاسی حیدرآباد شہر کو پانی فراہم کرنے والے ادارے کے سربراہ کے بیان سے ہوتی ہے۔

انہوں نے اپنے بیان میں کئی ناکامیوں کا اعتراف کیا ہے: (۱) جو پانی عوام کو ''صاف پانی'' کے نام پر فراہم کیا جاتا ہے وہ درحقیقت ''صاف'' نہیں ہوتا۔ (۲) شہری ادارے بھی پوری طرح پانی کی فراہمی میں ناکام رہے ہیں۔ عوام کو مجبوراً پانی خریدنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ (۳) پانی جیسا بنیادی مسئلہ اور انسانی حق حکومت کے ترجیحات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا اندازہ مختلف شعبوں کے لیے مختص بجٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا اس بات پر زور ہے کہ عوامی سہولتوں کی نجکاری کی جائے۔ وہ اپنے قرضوں کو عوامی سہولتوں کے اداروں کی نجکاری سے جوڑتے ہیں جس کے نتیجے میں لاکھوں افراد پینے کے صاف پانی سے محروم ہوگئے ہیں۔

عالمی بینک نے ۱۹۹۰ اور ۲۰۰۲ کے عرصہ کے دوران حیدرآباد کو پانی کی فراہمی والے جیسے اداروں کو دنیا بھر میں ۲۰ بلین ڈالرز کا قرضہ دیا جس میں سے ایک تہائی اداروں کو صرف اس شرط پر قرضہ دیا گیا کہ ان کو نجی مالکان کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا۔ اسی عرصہ کے دوران پانی کی فراہمی کے ایک بین الاقوامی کمپنی کی کمائی ۵ بلین ڈالرز سے بڑھ کر ۱۲ بلین ڈالرز ہوگئی۔ نجکاری کے بعد کمپنیاں عوام کو پانی فروخت کرتی ہیں، عوامی نلکے بند کردیے جاتے ہیں اور عوام پانی خریدنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

حکومت کی ماہی گیر پالیسی اور بڑے ٹرالرز کے خلاف احتجاج

مچھیرے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں اور خواتین نے حکومت کی ماہی گیری سے متعلق پالیسی کو مسترد کرتے ہوئے اس کے خلاف مظاہرہ کیا۔

مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ موجودہ پالیسی کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ اس کے تحت بڑے بڑے غیر ملکی ٹرالرز اس خطے میں مچھلیوں کے ذخیرے کو ختم کر رہے ہیں۔ انہوں نے پالیسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ مخصوص فائدے کو نظر میں رکھ کر ملک کی ماہی گیری کی صنعت کے مستقبل کو داؤ پر لگایا جا رہا ہے۔ ڈان، ۲۱، فروری ۲۰۰۳

حکومت نے مقامی ماہی گیروں کے احتجاج کے پیش نظر ستمبر ۲۰۰۲ میں بڑے ٹرالرز کے لائسنس منسوخ کرتے ہوئے ان کی مچھلی پکڑنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ لیکن حال ہی میں یہ پابندی ہٹا دی گئی ہے۔ جس پر سخت تنقید کی جا رہی ہے۔ ماہی گیروں کی ایک تنظیم کے رہنما نے کہا ہے کہ نئی پالیسی کے تحت حکومت نے غیر ملکی ٹرالرز کو اجازت دی ہے کہ اب وہ ۱۲ بحری میل کے فاصلے سے ماہی گیری کا حق رکھتے ہیں لیکن یہ ٹرالرز مقامی ماہی گیروں کے متعین حدود میں داخل ہو کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہ ٹرالرز تین کلومیٹر پر پھیلے ہوئے جال استعمال کرتے ہیں جس میں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مچھلی پھنستی ہے۔ بعد میں چھوٹی اور فالتو مچھلیاں سمندر میں پھینک دیے جاتے ہیں جو ماحولیاتی آلودگی کا سبب بھی بنتی ہیں۔

صدیوں سے مچھلی پکڑنے والی مقامی آبادی اور ماحول کو بچانے کے لیے نئے قوانین یا پرانے قوانین پر عملدرآمد سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ بڑے بڑے کشتیوں اور غیر ملکی ٹرالرز کی شکار پر مستقل پابندی کی ضرورت ہے تاکہ ماہی گیر طبقہ معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے قابل رہے۔ ورنہ اس طبقہ کی تباہی یقینی ہے۔

رخ زمانہ.....

جینیاتی خوراک کے معاملے پر امریکہ اور یورپ میں اختلاف

امریکی نمائندہ تجارت نے کہا ہے کہ امریکہ یورپی یونین کا جینیاتی طور پر تیار کردہ اشیاء (جی ایم اوز) پر پابندی کے خلاف ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں ایک مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے یورپی یونین کی طرف سے جینیاتی طور پر تیار کردہ اجسام پر عائد پابندی کو ''غیر اخلاقی'' اور ''ٹیکنالوجی دشمنی'' قرار دیا۔ انہوں نے کہا ''میرے نزدیک یہ اخلاق کے منافی ہے کہ لوگوں کو افریقہ میں اس لیے خوراک نہیں پہنچائی جا سکی کیونکہ لوگوں نے جینیاتی انجینئرنگ کے متعلق خطرات ایجاد کر لیے ہیں''۔ لیکن یورپی یونین کے اہلکار بظاہر اس سال کے آخر تک کسی بھی طرح یہ پابندی ہٹانے پر تیار نظر نہیں آتے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۹ سے سات یورپی ریاستوں فرانس، اٹلی، بیلجیئم، یونان، ڈنمارک، لکسمبرگ اور آسٹریا کی طرف سے عائد پابندی امریکی مکئی، کپاس اور سویابین کی برآمد کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ جینیاتی اجسام کے معاملے کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی سطح پر اٹھانے سے امریکہ کا یورپ کے خلاف نیا محاذ کھلے گا۔

دی نیوز، یکم، جنوری ۲۰۰۳

امریکہ دنیا بھر میں جینیاتی پودوں اور خوراک کو پھیلانے پر تلا ہوا ہے۔ اس کاروبار سے امریکی کمپنیوں کا منافع وابستہ ہے۔ دنیا بھر میں جینیاتی فصلوں اور خوراک پر سائنسدانوں اور عوامی حلقوں کی طرف سے اعتراضات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ حکومتوں کو مجبوراً ان کی درآمد پر پابندی لگانی پڑی ہے۔

اس مزاحمت نے امریکی حکمرانوں کو پریشان کر دیا ہے اور اب وہ دھونس اور دھمکی پر اتر آئے ہیں۔ یورپ اور افریقہ کی بہ نسبت ایشیاء میں ان کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں ہے۔ چین، بھارت اور پاکستان جیسے ممالک اپنی زرعی معیشتوں کو جدید بنانے کی دھن میں ایک طرف جینیاتی فصلوں کو قبول کر رہے ہیں تو دوسری طرف نجی شعبے کے عمل دخل کو بڑھا رہے ہیں اس طرح مقامی آبادیاں خوراک کے لیے مضر صحت جینیاتی خوراک اور بڑی کمپنیوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

بوتل میں فروخت ہونے والے پینے کے پانی میں خطرناک کیڑے مار ادویات کی موجودگی

سائنس اور ماحولیات سینٹر، ہندوستان کی ایک تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہندوستان میں بوتل کے اندر فروخت ہونے والے پانی میں کیڑے مار ادویات کی مقدار عالمی سطح پر متعین حدود سے ۱۰۴ گنا زائد مقدار میں پائے جاتے ہیں اس میں کوکا کولا کا ''کین لے'' نامی بوتل کا پانی بھی شامل ہے۔ بوتل کے پانی میں کیڑے مار ادویات کی مقدار ۳۶٫۴ فیصد پائی گئی ہے جو کہ یورپی معاشی کمیونٹی کے معیاری حد سے زیادہ ہے۔ تحقیق کے مطابق دہلی شہر میں دستیاب ۱۷ نامی گرامی پانی کے نمونوں میں سے صرف ایک نمونہ ایسا پایا گیا جس میں مضر صحت باقیات موجود نہیں تھے۔

دی نیوز، ۶، فروری ۲۰۰۳

سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہونے والی ترقی کی وجہ سے بے شمار مسائل نے جنم لیا ہے جس میں ماحولیاتی آلودگی ایک طرف اور دوسری طرف پانی جیسے بنیادی انسان حق سے ریاست کی دست برداری ہے۔ صنعتی اور زرعی آلودگی نے پانی کے ذخائر کو آلودہ کر دیا ہے۔ جہاں اس آلودگی کی وجہ منافع کی خاطر کی جانے والی سرمایہ کاری ہے وہاں اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے فائدہ بھی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں ہی اٹھا رہی ہیں۔ جن کی پشت پناہی اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے اور عالمی بینک کر رہا ہے۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ڈی ڈی ٹی جیسی مضر صحت ادویات ماحول میں کس قدر موجود ہیں اور دوسری طرف ان پر عائد پابندی پر کس قدر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس تحقیق نے ان لوگوں کے تحفظات کو بھی ریزہ ریزہ کر دیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ شہریوں کو پینے کا صاف پانی کی فراہمی سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ وہ بوتل کا صاف پانی خریدنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

پانی کی اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عوام کی صحت، عالمی کمپنیاں، نجکاری، کیڑے مار ادویات، سرمایہ کاری، ماحولیاتی آلودگی اور ریاستی ذمہ داریاں کس قدر آپس میں قریبی تعلق پر استوار ہیں اور کس طرح ایک نظام کا حصہ ہے۔

ٹوکیو میں وزارتی کانفرنس ناکام ہوگئی

دوہا کی وزارتی اجلاس ۲۰۰۱ کے بعد ۲۲ ممالک سے تعلق رکھنے والے وزرائے تجارت کی دوسری وزارتی اجلاس ۱۴۔۱۶ فروری کو ٹوکیو میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈبلیو ٹی او کی بات چیت میں حائل ہونیوالی رکاوٹوں کو دور کرنے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کی جاسکی۔ عراق پر جنگ مسلط کرنے کا خطرہ اجلاس پر منڈلاتا رہا۔ امریکہ اور یورپی یونین کے جنگ کے معاملے پر پڑنے والی خلیج نے تجارتی بات چیت کو بھی پیچیدہ بنا دیا۔

تجارت سے متعلق تحفظ حق ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) پر ہونے والی بات چیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا غریب ممالک کی ضروری ادویات تک رسائی اور ترقی پزیر ممالک کے لیے خصوصی اور جانبدارانہ برتاؤ کے حوالے سے آگے بڑھنے میں حقیقی پیش رفت نہ ہونے کی وجہ سے ترقی پزیر ممالک کے ان شکوک و شبہات کو مزید مستحکم کر دیا ہے کہ دوہا ڈیولپمنٹ ایجنڈا کی ''ترقی'' والا حصہ صرف نعرے بازی ہے۔

زراعت سے متعلق چیئرمین زرعی کمیٹی کا تیار کردہ مسودہ ٹوکیو اجلاس کے ایجنڈے پر سرفہرست رہا۔ اجلاس کے آخر تک شرکاء نئے مسودہ کو مستقبل میں ہونے والی بات چیت کے ''نقطہ حوالہ'' بنانے پر متفق نہ ہو سکے۔ ٹوکیو کے منی وزارتی اجلاس میں ۱۶ یورپی این جی اوز نے یورپی تجارتی کمشنر کو ایک خط لکھا جس میں ڈبلیو ٹی او کی بات چیت کو مزید وسعت دینے پر احتجاج کیا گیا۔ احتجاجی این جی اوز یورپی یونین کی ایک تجویز پر مزاحمت کر رہی ہیں۔ اس تجویز میں یورپی یونین نے کہا کہ ڈبلیو ٹی او نے سرمایہ کاری، حکومت کی طرف تجارت کے ضمن میں سہولتوں اور ان تک حصول کا شفاف ہونا، مقابلہ کی پالیسی جیسے امور کو کینکون وزارتی اجلاس کے بعد زیر بحث لانے کا اختیار پہلے ہی سے حاصل کر لیا تھا۔ بریجز ویکلی، ٹریڈ نیوز ڈائجسٹ، جلد ۷، نمبر ۶، ۱۹، فروری ۲۰۰۳

مونسانٹو: مشکلات کا شکار

امریکہ کے محکمہ زراعت نے کہا ہے کہ شائد وہ مونسانٹو کمپنی کے خلاف سخت شرائط لاگو کرے۔ اس کا مقصد اس چیز کو یقینی بنانا ہے کہ مونسانٹو کمپنی امریکہ میں جینیاتی انجینئرنگ سے پیدا کردہ گندم اس وقت ہی امریکہ میں فروخت کرنے کی پابند ہے جب تک بیرونی منڈیاں اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔

مونسانٹو کی ''راؤنڈ اپ ریڈی'' نامی گندم کا امریکی اور کینیڈا کی حکومت معائنہ کر رہی ہے اور اگلے دو سالوں میں اس کی تجارتی حوالوں سے استعمال کی منظوری دے سکتی ہے۔ راؤنڈ اپ ریڈی دنیا میں گندم کی پہلی جینیاتی قسم ہوگی۔

تنقید نگاروں کے مطابق صارفین کا جینیاتی طور پر پیدا کردہ گندم کی طرف رویہ اتنا منفی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی خریداروں کو اگر یہ گندم فروخت کیا گیا تو صارفین امریکہ کی پیدا کردہ ہر قسم کی گندم خریدنے سے انکار کر دیں گے۔

مونسانٹو کی نئی جینیاتی گندم میں جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے یہ خصوصیت ڈالی گئی ہے کہ وہ فالتو جڑی بوٹی تلف کر سکتی ہے۔ امریکہ دنیا میں جینیاتی فصلیں پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ ڈائیورس وومن فار ڈائی ورسٹی۔ ۲۱، مارچ ۲۰۰۳

اگر امریکہ دنیا میں جینیاتی فصلیں اور خوراک پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے تو اس کی وجہ اس کی زرعی اور کیمیائی کمپنیاں ہیں۔ اس طرح امریکی ریاست اور کمپنیوں کا مفاد دو علیحدہ چیزیں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ عالمی سطح پر تجارتی معاہدوں اور اداروں کے علاوہ طاقت کے ذریعے زرعی آزادی کے درپے ہے۔

امریکی محکمہ زراعت کی لاگو کی گئی پابندی کی اہم وجہ حکومت پر عوامی دباؤ ہے۔ کیونکہ ابتداء ہی سے سائنسدانوں اور عوامی حلقوں نے انسانی صحت کے لیے مضر صحت ہونے اور ماحولیاتی بگاڑ کی وجہ سے جینیاتی فصلوں کی شدید مخالفت کی ہے۔ امریکی حکومت کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت ہی جلد اس کی اجازت دے دی جائے گی۔ کیونکہ کے ایک اخباری اطلاع کے مطابق مونسانٹو کپاس کی نئی قسم بولگارڈ۔۲ کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ زرعی ماہرین پہلے ہی بی ٹی کپاس پر اعتراض کر رہے تھے اب ایک نئی قسم بھی آ گئی ہے۔

گندم کی تیار کردہ نئی جینیاتی فصل کے معاملے کو امریکہ سے ہٹ کر وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے اثرات صرف امریکہ یا یورپ تک محدود نہیں رہیں گے۔ دنیا بھر میں جینیاتی مکئی اور سویابین کے تیل کی طرح یہ گندم بھی برآمد کی جائیگی جس سے عوام اور ماحول متاثر ہوں گے اور اس کی کاشت پاکستان جیسے ممالک میں بھی ہوگی۔ آج مونسانٹو پاکستان میں جینیاتی کپاس، ''بی ٹی کاٹن'' کی اجازت کی طلبگار ہے اور کل جینیاتی گندم کی اجازت طلب کر رہی ہوگی۔ بی ٹی کاٹن کی کاشت ہمارے پڑوسی ممالک بھارت اور چین میں قانونی قرار دے دی گئی ہے اور پاکستان میں کسی بھی وقت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ ان خطرات سے نمٹنے کا واحد حل عوامی تحریک کے ذریعے مونسانٹو جیسی کمپنیوں کا مقابلہ ہے۔ عالمی سطح پر سرمایہ داری مخالف تحریک میں یہ مسئلہ شامل ہے۔ اب مقامی سطح پر اسے اٹھانے کی ضرورت ہے۔

کینز گروپ کا اجلاس: زرعی تجارت کی دہری پالیسی

بلیویا، لاطینی امریکہ میں کینز گروپ کے ممبران اور امریکہ نے ایک اجلاس میں شرکت

کی۔دونوں نے آزادتجارت کومزیدفروغ دینے کے لیے یکساں موقف اختیار کیا۔لیکن اس کے باوجود کینز گروپ امریکہ کے ساتھ مل کر مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے پر راضی نہیں ہوا۔کینز گروپ کا کہنا تھا کہ ترقی یافتہ ممالک نے زرعی تجارت پر ایسے تجویزی مسودے پیش کیے ہیں جن میں زراعت کے حوالے سے بہت تھوڑے اصلاحات کی گنجائش ہے۔

اس اجلاس سے پہلے کینز گروپ کے برآمدی گروہوں کے رہنماؤں کا کہنا تھا کہ دوہاوزارتی اجلاس،۲۰۰۱ میں لازم قرار دیا گیا تھا کہ زرعی تجارتی اصلاحات قابل قبول حدتک شامل کیے جائیں۔ورنہ تو پھراس اجلاس کوختم کردینا چاہیے۔کینز گروپ یہ چاہتا ہے کہ امریکہ، یورپی یونین، جاپان اورجنوبی کوریا کی منڈیوں تک رسائی کو بہتر بنایا جائے۔اس کے علاوہ زرعی شعبے میں پیداوار کے لیے ملکی امداداور برآمدی مراعات جو خاص کرکے جاپان، امریکہ، یورپی یونین اورکوریا اپنے زرعی شعبے کوفراہم کرتے ہیں، ان کو بہت حدتک کم کردیا جائے یا پھر بالکل ختم کردیا جائے۔

امریکہ، یورپی یونین، جاپان اورکوریا کے کسانوں کوسالانہ ۳۱۰ بلین ڈالرز مراعات کی شکل میں دیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کینز گروپ کی کسانوں کو عالمی منڈی میں اپنی زرعی پیداوار بیچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ان کو اپنے ملک میں اتنی زیادہ مراعات حاصل نہیں ہیں اور اس طرح وہ عالمی منڈی میں قیمتوں پر مقابلہ نہیں کرپاتے۔

کرنیز گروپ ۱۹۸۶ میں بنایا گیااوراس وقت زرعی برآمد کرنے والے ۱۷ ممالک پر مشتمل ہے۔اسے بعض اوقات عالمی تجارتی بات چیت میں امریکہ اور یورپ کے بعد تیسری قوت سمجھا جاتا ہے۔ (ag-impac@iatp.org) ۲۳،اکتوبر ۲۰۰۲

تیسری دنیا کے کسانوں کی طرح کینز گروپ کے ممبران جن میں سے ۱۴ ممالک کا تعلق تیسری دنیا سے ہے کو بھی یورپی یونین اورامریکہ کی دورخی پالیسیوں کا سامنا ہے۔اب یہ ایک عام مسئلہ بن کررہ گیا ہے کہ یہ دوعلاقے اپنے زرعی شعبے کو بھرپور مراعات پہنچا کر اپنے زرعی شعبے کومکمل حفاظت تو دیتے ہیں لیکن تیسری دنیا میں مراعات دینے جیسے اقدامات پرسختی سے پابندی عائد کردیتے ہیں۔

ورلڈسوشل فورم: گلوبلائیزیشن مخالف گروہوں کا محور

اگرچہ اس سال ورلڈاکنامک فورم اور ورلڈسوشل فورم پرعراق کا تنازعہ چھایا رہا۔لیکن اس کے باوجود شرکاء نے بین الاقوامی تجارت، ڈبلیوٹی او اور ڈبلیوٹی او کی کینکون میں آئندہ ہونے والے اجلاس کو بھی چھیڑا۔ورلڈاکنامک فورم سوئٹزرلینڈ کے مقام ڈیویس میں ۲۳-۲۸ جنوری اور ورلڈسوشل فورم بھی اسی دورانیہ میں برازیل کے شہر پورٹ الیگرے میں منعقد ہوئی۔ورلڈاکنامک فورم میں عالمی رہنماؤں، خاص کرکارپوریشنوں کے نمائندوں نے مل کر عالمی شہریت اور دوسرے عالمی چیلنجوں کوموضوع بحث بنایا۔ ورلڈسوشل فورم جس کا مقصد مختلف خیال تنظیموں کے گروہوں اور ایسے افراد کومتحد کرنا ہے جوآزادتجارت کے اصولوں (یعنی نیولبرل ازم) کی مخالفت کررہے ہیں۔

بریجز ویکلی ٹریڈ نیوز ڈائجسٹ، جلد ۷ نمبر ۳، ۲۰۰۳

خوراک کی حق خودارادیت کے عوامی نیٹ ورک کا قیام

ورلڈٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیوٹی او) کا زرعی معاہدہ، گلوبلائزیشن اور آزادتجارت کے پالیسیوں اور اس سے مرتب ہونے والی تباہی کے جواب میں خوراک کے حق خودارادیت کے تحفظ کو آگے بڑھانے کے لیے عوامی اتحاد کا نیٹ ورک قیام کیا گیا ہے۔

پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک ایشیاء و بحرالکاہل نے آئی بون فاؤنڈیشن فلپائن کے ساتھ مل کر ''مہم برائے خوراک کی حق خودارادیت نیٹ ورک'' کا آغاز پین اے پی کی گیارویں سالگرہ پر کیا۔

نیٹ ورک زراعت، خوراک اورتجارتی مسئلوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھے گا۔ جس کا مقصد بنیادی سطح پر کام کرنے والی کسان تحریکوں اور کسانوں، ماہی گیروں، عورتوں اور مقامی آبادی کے ساتھ ساتھ کسان مزدور کے ساتھ مل کر خوراک کے حق خود ارادیت کے مطالبوں پر کام کرنا ہے۔اس مسئلے کے لیے یہ نیٹ ورک این جی اوز اور مختلف گروہوں کی مدد بھی حاصل کرے گا۔

اس موقع پر پین اے پی کی سربراہ نے کہا ''دنیا بھر میں خوراک کی حق خود ارادیت گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والے خطرے کے ردعمل میں کسان تحریک کا ولولہ انگیز مطالبہ بن چکا ہے جوتجارت کی آزادی اور ڈبلیوٹی او کی وجہ سے تحفظ خوراک کو لاحق ہیں۔اس نیٹ ورک کے ذریعے حق خوراک، حق اراضی اور پیداواری ذرائع، پائیدار زراعت اور عورتوں کا زراعت میں بھرپور کردار کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کو آگے بڑھانا شامل ہے''۔

''ڈبلیوٹی اوآزادتجارت کا سب سے بڑا آلہ ہے جوتیسری دنیا کے ممالک میں دن بہ دن تحفظ خوراک اورعوام کے خوراک کے حق خودارادیت کوتباہ کررہا ہے۔اسی وجہ سے دنیا بھر کے کسان تنظیمیں اورعوام مطالبہ کررہے ہیں کہ ''ڈبلیوٹی او کوزراعت سے باہر کرو''۔

پیپلز کاروان، ۲۰۰۰ pcarvan@tm.net.my

عورتوں کا عالمی دن

افروز سومرو

۸ مارچ دنیا بھر میں عورتوں کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ایک تقریب ۱۸ مارچ کو ٹنڈو محمد خان، ضلع حیدرآباد میں روٹس فار ایکوٹی کے زیر اہتمام منائی گئی۔ اس پروگرام میں چھ گاؤں کی تنظیموں سے مزدور کسان عورتوں نے شرکت کی۔

تقریب کے آغاز میں عورتوں کے عالمی دن کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی جس میں بتایا گیا کہ یہ دن عورتوں کی ایک طویل مدت سے جاری جدوجہد اور تحریک کی یاد تازہ کرنے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن صدیوں سے جاری ظلم و جبر اور استحصال، عورتوں پر حقوق مانگنے پر کی جانے والی مظالم اور معاشرے میں عورتوں کے مساوی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا عہد کیا جاتا ہے۔

عورتوں کے عالمی دن کی تقریب میں عورتیں گیت گاتے ہوئے

اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ عورت آج کی ترقی یافتہ دور میں زندگی کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو منوا رہی ہے۔ مگر انہیں پدرشاہی نظام کے تحت غلامانہ حیثیت دی گئی ہے۔ اس نظام کے تحت یہ دنیا مرد کی ہے اور اس کے بنائے ہوئے قانون ان ہی کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

عورت کا ہر سطح پر استحصال کیا جاتا ہے۔ شہر سے لے کر گاؤں تک ہر جگہ ایک ہی صورتحال نظر آتی ہے۔ عورت کو اپنی مرضی سے جینے کا اختیار نہیں دیا جاتا۔ شہر میں صورتحال تھوڑی بہتر نظر آتی ہے کیونکہ وہاں کی عورتوں میں تعلیم زیادہ عام ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ ''بہنوں، آپ سب کو چاہیے کہ خود بھی پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں کیونکہ ایک ایسا مشکل وقت آ رہا ہے جس کی آپ کو ابھی سے تیاری کرنی پڑے گی۔ اپنے اولاد کو صحیح تربیت دیں اور ان کو عورت کی عزت کرنا سکھائیں''۔

عورت کے معاشی استحصال کے حوالے سے کہا گیا کہ ''استحصال کی حد تو یہ ہے کہ صبح سے شام تک زمینوں پر کام کرنے والی عورت کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے کام کی اجرت کتنی طے ہوئی ہے! ایک مفکر کا قول ہے کہ آمریت سب سے بری چیز ہے مگر بدترین آمریت وہ ہے جو آزادی کے لبادے میں کی جائے''۔ ''بہنو، حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر کس لو! کیونکہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب ہماری ساری زمینیں دوسروں کے قبضے میں چلی جائیں گی اور سارے سرمایہ دار اپنے مفاد کے لیے غریبوں کا استحصال کریں گے۔ بیروزگاری اور بھوک مزید بڑھے گی۔ آپ کو چاہیے کہ سب مل کر جدوجہد کریں اور ظلم کی ان زنجیروں کو توڑ دیں جس نے آپ کو جکڑ کے رکھا ہے۔''

اس تقریب میں تین مختلف اسٹال لگائے گئے تھے جس میں سے ایک جنگ اور آزاد معیشت کا آپس میں تعلق اور اس کے منفی اثرات کے ذریعے جو بھوک اور قحط دنیا پر مسلط ہوتا ہے، تصویروں کی مدد سے نمایاں کیا گیا تھا۔ اس تصویری نمائش کے اسٹال میں گلوبلائیزیشن کی پالیسیوں کے اثرات سمجھائے گئے، خاص کر کے اس عمل کو تصویر کے ذریعے پیش کیا گیا تھا کہ کس طرح مزدور کسان کی محنت، مصنوعات کی شکل میں تبدیل ہونے کے بعد دوبارہ پھر زر کی شکل اختیار کرتے ہوئے غیر ملکی اور ملکی سرمایہ دار کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ آزاد معیشت کی پالیسیوں پر عمل کے بعد بھوک اور قحط بڑھ رہا ہے اور لوگوں کو اپنی زندگی کی گاڑی کھینچنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ امریکہ اور دوسرے طاقتور ممالک کی کمپنیوں نے آزاد معیشت کا جھانسا دے کر انسان کے خوراک کے وسائل پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ عراق کے حوالے سے موجودہ صورتحال پر عورتوں کو معلومات فراہم کی گئیں۔ ''عورت جنگ کے خلاف'' کے اسٹال پر عورتوں نے عراق پر امریکی حملے کی مذمت کرتے ہوئے دستخطی مہم کا آغاز بھی کیا۔ ایسی عورتیں جن کو دستخط کرنا نہیں آتا تھا، انہوں نے اپنے نام کی کڑھائی کر کے عراق کے خلاف جنگ میں اپنی آواز شامل کی۔ عورتوں کا موقف تھا کہ ہم سب عورتیں سامراجی جنگ کے خلاف ہیں کیونکہ اس سے تباہی پھیلے گی جس سے عورتیں اور بچے سب سے زیادہ متاثر ہوں گے۔

تصویروں کے ذریعے یہ بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی کہ امریکی سامراجی حکمت عملی دو طرح سے عمل میں آتی ہے۔ ایک تو جنگ کے ذریعے وسائل پر

قبضہ کیا جاتا ہے جس سے بھوک وافلاس بڑھتی ہے، نتیجے میں سب سے زیادہ عورت اور بچے ہی متاثر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک خوراک کے وسائل پر آزاد تجارت کے اصولوں کو کسانوں پر حاوی کر کے، دنیا بھر کے مزدور کسان کو آدھی روٹی کھانے پر مجبور کرتے ہیں۔

مزدور کسان عورتوں نے اسٹالوں کا دورہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا کچھ یوں اظہار کیا کہ ''محنت تو ہم لوگ کرتے ہیں اور تمام دولت بیرونی ممالک منتقل ہو جاتی ہے!'' انہوں نے امریکہ کو خاص طور پر ظالم ملک قرار دیا۔ سامراجی قوتوں کی تیل کی ہوس کو اپنی زندگی سے جوڑتے ہوئے ایک مزدور کسان عورت نے اپنے گاؤں کے پاس تیل نکلنے کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''پہلے زمین سے پانی نکلتا تھا، مگر اب تیل ہی تیل نکلتا ہے۔'' ایک عورت کا کہنا تھا کہ ''اس تیل کی وجہ سے آہستہ آہستہ کمپنی والے ہمیں ہٹا کر ہمارا گوٹھ ہی ختم کر دیں گے''۔

اس تقریب میں عورت کے اجرت اور بغیر اجرت کے کام کو خاص موضوع بنایا گیا۔ عورت گھر کا ہر کام کرتی ہے جس کا اسے کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ ایک عورت کے کہنے کے مطابق ''اگر مانگو تو پٹائی ہوتی ہے''۔ دوسری طرف اجرت کے عوض کام کرنے پر بھی معاوضہ بہت تھوڑا اور وہ بھی مردوں کے ہاتھوں میں جانے کے لیے ملتا ہے۔ عورتوں نے کہا کہ ''ہم اتنی محنت اور جدجہد دو وقت کی روٹی کے لیے کرتے ہیں اور اسی لیے مجبور ہیں کہ اتنے کم پیسوں میں کام کریں''۔

اس موقع پر تحفظ خوراک کے حوالے سے بھی ایک اسٹال لگایا گیا تھا۔ جس میں مختلف قسم کے کھانے اور بیج رکھے گئے تھے جو عورتیں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اس میں گندم، چاول اور باجرے کی روٹی کے علاوہ پالک، گوبھی، بینگن، بھنڈی اور چنے کا سالن، مکھن اور لسی شامل تھے۔ بیج میں توری، گوار پھلی، گندم، چاول، پیٹھا اور مرچیں شامل تھیں۔

اس اسٹال پر عورتوں کو بتایا گیا کہ پہلے زمانے میں ہمارے پاس کھانے کے لیے مختلف قسم کے خوراک تھی مگر اب ایک وقت کا سالن بھی نہیں ہوتا۔ اپنے ہی گھر کی مال مویشی سے حاصل کیا گیا خالص مکھن اور دودھ وافر مقدار میں ہوتا تھا، مگر اب جب سے جدید طریقہ زراعت کو ہم پر مسلط کیا گیا ہے تو بھوک بڑھتی جا رہی ہے اور تحفظ خوراک کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ جس کا ایک ناکافی حل یہ ڈھونڈھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں اضافی زمینوں پر دیسی بیج سے مختلف قسم کی سبزیاں اگائیں تاکہ غذا کی قلت ختم ہو سکے اور خالص غذا میسر ہو۔ عورتوں نے جو رائے دی وہ کچھ یوں تھی۔

''ہمارے پاس زمین اپنی نہیں، ہم بیج اور سبزی کہاں اگائیں؟ زمیندار ہمیں بیج محفوظ نہیں کرنے دیتے''۔ کچھ عورتوں نے کہا کہ ''کیڑے مار دواؤں کی وجہ سے غذا خالص نہیں رہی اور جدید کاشتکاری کی وجہ سے صورتحال زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ ہمیں ضرورت کے مطابق غذا نہیں ملتی اور جو بھی غذا ملتی ہے وہ خالص نہیں ہوتی، اس لیے ہماری صحت متاثر ہو رہی ہے''۔

عورتوں کے اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے ''امداد باہمی'' اسٹال میں بھی خاصی دلچسپی ظاہر کی گئی۔ اسٹال میں قصبہ کالونی کراچی اور ٹنڈو محمد خان کے مختلف گوٹھوں کی عورتوں کی بنائی ہوئی مختلف مصنوعات رکھی گئی تھیں۔ عورتیں نمائش میں خود اپنے بنائی ہوئی مصنوعات دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''عورتیں جنگ کے خلاف'' اسٹال پر: شرکاء جنگ اور آزاد معیشت کے اثرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بھوک اور قحط کے موضوع پر بنائے گئے پوسٹر پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے۔

عورتوں نے اس موقع پر مختلف ٹیبلو، ڈرامہ، گیت، خاکے پیش کیے جس میں عورتوں کی سرگرمیاں، کسی بھی فیصلے میں عورتوں کی عدم شمولیت اور ان کی غلامانہ حیثیت، عزت کی پامالی، مرضی کے بغیر شادی، شادی کے بعد غیر یقینی صورتحال، پیسوں کے خرچے کا اختیار عورت کے پاس نہ ہونا، عورتوں پر کیڑے مار ادویات کے اثرات اور کیڑے مار ادویات بنانے والی بین الاقوامی کمپنیوں کو ان کی زہریلی تجارت کے فوائد، عورتوں کی ناخواندگی اور اس حوالے سے باپ اور بھائی کی طرف سے ہونے والے جبر واستحصال موضوع بحث بنے رہے۔

آخر میں ایک مزدور کسان عورت نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیں کھانا، کپڑا اور اچھا گھر مہیا کرے ہم مانتے ہیں کہ تعلیم ایک زیور ہے۔ اندھے کے لیے سہارا اور روشنی ہے، مگر ہمارے پاس روٹی نہیں ہم کیسے تعلیم کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے غربت۔ ہے کوئی جو ہمیں اس غربت کی دلدل سے باہر نکالے؟ حکومت ہماری مدد کرے تاکہ ہم غربت کی چکی میں پسنے سے بچ جائیں۔ ترقی کی سوچ ہمیں کیسے آسکتی ہے جب ہمارے پیٹ خالی ہوں۔ ہمیں تو صرف پیٹ بھر کر کھانا مل جائے تو یہ بھی ہمارے لیے بہت ہے۔ یہ جاگیردار کی سازش ہے کہ ہم کو کم سے کم معاوضہ ملے۔ ہمیں اگر معاوضہ پورا ملے تو شاید ہمارے حالات بھی بہتر ہو جائیں۔ اس وقت ہمیں اتنا معاوضہ دیا جاتا ہے کہ جس سے گھر کی دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے پوری ہوتی ہے''۔